ست پرکاش سنگر

آشا دیپ

ست پرکاش سنگر

آشا دیپ

ست پرکاش سنگر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اشاعت : ۱۹۹۴ء
قیمت : ساٹھ روپے
سرورق : رزّاق ارشد
طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

زیر اہتمام
پریم گوپال متّل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سوانحی خاکہ

نام : ڈاکٹر ست پرکاش سنگر
پیدائش : ۸ ، اپریل ۱۹۱۷ء ، مین پوری (اتر پردیش)
آبائی مقام : مورون (MORON) ، ضلع جالندھر (پنجاب)
تعلیم : پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی ۔ اے آنرز اسکول آف ہسٹری اور وہیں سے ایم ۔ اے آنرز اسکول اِن ہسٹری پاس کیا ۔ یونیورسٹی میں دونوں امتحانات میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور یونیورسٹی اسکالر شپ حاصل کی ۔

گولڈ میڈل بھی حاصل کیا ۔ پونہ یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔

تشکیلِ پاکستان سے قبل ڈی ۔ اے ۔ وی ۔ کالج لاہور میں ہسٹری کے پروفیسر تھے اور اس کے بعد گورنمنٹ حمیدیہ کالج ، بھوپال میں پڑھاتے رہے ۔ ۱۹۶۰ء میں مدھیہ پردیش سرکار کی کلاس (۱) سے مستعفی ہو کر پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں ہسٹری کے پروفیسر رہے ۔ ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہو کر پانچ سال تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیرِ اہتمام ایک ریسرچ پروجیکٹ پر کام کیا اور چار سال تک انڈین کونسل

آف ہسٹاریکل ریسرچ میں ہسٹری کے دو پروجیکٹوں پر کام کیا اور کونسل کے فیلو رہے۔

مغل ہسٹری سے متعلق بنیادی فارسی ماخذوں پر مبنی پانچ درجن سے زائد تحقیقی مضامین معروف انگریزی رسائل میں شائع ہوئے۔ "عہدِ مغلیہ میں جرم و سزا" کتاب بہت مقبولِ عام ثابت ہوئی۔ عہدِ مغلیہ میں سوتی، ریشمی اور اونی پارچات پر ایک درجن سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اور اسی دور پر ایک اور کتاب "FOOD AND DRINKS" بھی تیار کی ہے۔ انگریزی ضخیم کتاب "عہدِ مغلیہ میں سماجی زندگی" زیرِ طبع ہے۔

اُردو میں اوّلین افسانہ "راہی" ہمایوں، لاہور میں اپریل ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں درجنوں افسانے اُردو میں ہند اور پاک کے معروف رسائل میں شائع ہوئے۔ خصوصاً ادبِ لطیف، شاہراہ، عالمگیر، افکار اور سیپ کراچی۔ شاعر، آجکل، نگار، نگارش، شیرازہ، تعمیر، جائزہ، جادہ، کردار اور فکر و فن۔ ہندی میں سات ناول، آٹھ افسانوی مجموعے۔ ڈراموں کے چار مجموعے اور ایک پورا ڈرامہ اور رپورتاژ شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو میں تین ناول اور ایک افسانوی مجموعہ چھپ چکا ہے۔

اپنے بھوپال کے قیام میں تقریباً دس سال تک ایک معروف ادبی مجلس حلقۂ دانشوراں کے واحد سکریٹری رہے۔ حلقہ کے پندرہ روزہ اجلاس انھیں کی قیام گاہ ہمایوں منزل اور پروفیسرز کالونی میں مکمّل باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتے رہے جس میں ہند کے مشہور شاعر اور قلم کار شرکت لیتے رہے۔ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں: فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری، مخدوم محی الدین، ظ۔ انصاری، ہری چند اختر،

کنھیا لال کپور، عرش ملسیانی، اعجاز صدیقی، کیفی اعظمی، بنّے میاں (سجاد ظہیر)
پریم وار برٹنی۔

مدھیہ پردیش میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز رہے۔

بھوپال میں ڈائریکٹر ایجوکیشن اور اسٹیٹ کمشنر آف اسکاؤٹس بھی رہے۔

مختلف کالجوں اور تعلیمی اداروں میں مختلف موضوعات پر انگریزی، ہندی،
اُردو اور پنجابی میں تقاریر بھی کیں۔

آج کل ادبیات میں مصروف ہیں اور اُردو میں ناول لکھ رہے ہیں۔

انتساب

اپنی دھرم پتنی

شریمتی کملا سنگر

کے نام

اندرونِ صفحات

تعارف

"کیوں صاحب! یہ سنگر صاحب کون ہیں؟" پرکاش پنڈت نے کافی کا پیالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"کون سنگر صاحب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"وہی جن کا افسانہ 'راہی' 'ہمایوں' میں چھپا ہے۔"

"ہوں گے کوئی۔" میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

"کہیں یہ وہی تو نہیں جن کی ایک کہانی ہندی ماہنامے 'سرسوتی' میں چھپی ہے۔" ہنس راج رہبر نے کہا۔

"میرے خیال میں میں نے آج ان کا ایک مضمون 'شگفتہ ریویو' میں پڑھا ہے۔" دیوندر ستیارتھی اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"عجیب نامعقول ہے۔" میں نے سنگر پر تاؤ کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک چھوٹا تین زبانوں میں لکھتا ہے یہ بھی کوئی شرافت......"

میں نے ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ یوسف ظفر ایک نوجوان کی معیت میں کافی ہاؤس میں داخل ہوئے، اور انھوں نے اپنے ساتھی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"سنگر صاحب سے ملئے - آپ افسانہ نویس ہیں۔" ہمارے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا - چھریرا بدن - گوراچٹا رنگ - گھنگریالے بال - اگر اس کی آنکھیں قدرے چھوٹی نہ ہوتیں تو یقیناً وہ ہندوستانی سکرین کا سب سے حسین ہیرو ہوتا۔ کافی کی میز پر طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا کہ سنگر صاحب جالندھر کے ایک بہت بڑے کالج میں تاریخ کا مضمون پڑھاتے ہیں اور شغل کے طور پر انگریزی، ہندی اور اردو میں افسانے اور مضامین لکھتے ہیں - سنگر صاحب کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ ہم سب ان میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے - وہ بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے - اِدھر کسی نے کوئی بات کی، اُدھر جھٹ انھوں نے ایسا فقرہ چست کیا کہ ہم سب لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد سنگر صاحب ایک دن ڈی۔ اے وی کالج لاہور میں بکلخت دارد ہوئے میں نے پوچھا "یہاں ایک آدھ دن ٹھہریے گا؟"

مسکرا کر کہنے لگے "ایک آدھ دن نہیں، عمر بھر ٹھہرنے کا ارادہ ہے"

میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"خیر تو ہے؟" فرمانے لگے۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں، میں آپ کے کالج میں آگیا ہوں۔" اس خبر سے مجھے واقعی مسرت ہوئی۔

"آپ کے ادبی مشاغل کا کیا حال ہے؟"

"ادھر چند دنوں سے میں نے دو تین درجن افسانے لکھے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کسی دن ان میں سے دو چار آپ کو سناؤں۔

"ضرور ضرور"

دوسرے دن سنگر صاحب میرے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں ہمایوں، ادبی دنیا، عالمگیر، سرسوتی، مادھوری اور متعدد رسائل تھے۔ اور انھوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شائع شدہ افسانے پڑھ کر سنانا شروع کئے۔

عموماً افسانہ سن کر مجھ پر وحشت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کیونکہ سننے کی نسبت میں افسانہ پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ لیکن سنگر صاحب کا پڑھنے کا انداز کچھ اتنا دلآویز تھا کہ مجھے لمحہ بھر کے لئے بھی اکتاہٹ کا احساس نہ ہوا۔

اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ملاقاتوں کے بعد بھی سنگر صاحب یاد آتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پنجاب سے غائب ہو گئے۔ کبھی سنا کہ سی، پی میں انسپکٹر آف سکولز ہو گئے ہیں۔ کبھی سنا کہ انہوں نے گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال میں پروفیسری کر لی ہے۔ کبھی یہ کہ پروفیسری چھوڑ کر چیف انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے ہیں۔ کبھی یہ کہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر جہانِ فانی سے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سنتا رہا کہ افسانہ نویسی کا شغل ایک مرض کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اب وہ جہاں بھی ہوتے ہیں، جیسے بھی ہوتے ہیں افسانے لکھتے رہتے ہیں۔ اس بات سے دل کو ایک گونہ مسرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ مسرت اس لئے کہ وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور افسوس یوں کہ اگر اس رفتار سے لکھتے رہے تو میں کم از کم اپنی مختصر سی زندگی میں ان کے تمام افسانے پڑھ نہیں سکوں گا۔

سنگر ان نوجوان افسانہ نویسوں میں سے ہے جس کے افسانے واقعی افسانے

ہوتے ہیں اور فنی زمانہ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے افسانوں میں ایک کامیاب کہانی کے جملہ لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ وہ غلطی سے بھی کبھی ایسی لغزش کا ارتکاب نہیں کرتا، جو افسانے کو "واقعہ" یا محض "خاکہ" یا ایک غیر دلچسپ مضمون بنا کر رکھ دے۔ انداز بیان پر اُسے خاص قدرت حاصل ہے۔ کوئی فقرہ یا جملہ ایسا نہیں ہوگا جو اُس نے سوچ کر نہیں لکھا ہو۔ اس کے ہر افسانے میں ایسی تشبیہات ملتی ہیں جنھیں پڑھ کر قاری لحظہ کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے چونک پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے صرف ایک افسانے "راہی" میں ایسی اچھوتی اور جاندار تشبیہیں ملتی ہیں جن کا جواب مشکل سے ملے گا۔

(۱) کیا ہے زندگی بھی ؟ چوراہے پر رکھا ہوا چراغ۔

(۲) برف کا چہرہ سرخی مائل ہوگیا، جیسے کسی حسینہ کے خوبصورت چہرے پر شرم سے سرخی کی لہر دوڑ جائے۔

(۳) ہمالیہ کے پگھلے ہوئے آنسوؤں کو دامن میں سنبھالے ایک پہاڑی چشمہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا، جیسے کوئی قزاق مالِ مسروقہ لے کر چلے۔

(۴) غلیظ پگڑیوں اور پھٹے ہوئے کوٹوں میں ملبوس شاہ جی کی دکان پر آکر وہ اس طرح ڈرتے ڈرتے سودا طلب کرتے، جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔

(۵) بھوتوں کے سائے کی طرح رات سر پر کھڑی تھی۔

سنگھ کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت شعریت اور حقیقت کا دلکش امتزاج ہے۔ نثر میں بہتوں نے شاعری کی ہے۔ نیاز فتح پوری سے لے کر منشی پریم چند تک ہر افسانہ نگار نے اپنے جوہر اس میدان میں دکھائے ہیں۔ لیکن سنگھ محض

شاعری کے لئے شاعری کبھی نہیں کرتا۔ اس کے افسانوں میں حقیقت رومان کا نقاب کچھ اس انداز سے اوڑھے ملتی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ چہرہ نقاب کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے، یا نقاب چہرے کی دلآویزی میں۔

"شکست" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہم تینوں زندگی کی لہر میں بہے جا رہے تھے۔ ہماری کشتی ساکن پانی پر چل رہی تھی۔ اسے طوفان نے پریشان کیا تھا، نہ گرداب نے۔ ہمیں محسوس ہوتا کہ زندگی ایک خوبصورت اصلیت ہے جس کی نئی تمنائیں، تازہ آرزوئیں اور جدید جستجوئیں ہمیں نامعلوم علاقوں میں کھینچے لئے جا رہی ہیں، جیسے زندگی کی تمام شاہراہیں ہمارے سامنے کھلی پڑی ہیں۔ منزلِ مقصد کے حصول کی تمنا ہمیں اتنا نہیں اکسا رہی تھی، جتنا نئے راستے تلاش کرنے کی دھن۔"

اسی افسانے میں یاس کا منظر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ دور مرگھٹ میں ایک چتا جل رہی ہے۔ لوگ اس پر لکڑیاں ڈال رہے ہیں۔ آگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس چتا میں میری تمام آرزوئیں جل رہی ہیں اور میری تمام تمنائیں جھلس رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی بھیڑ کم ہو گئی، شعلے مدھم ہو گئے، اور آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ میں نے راکھ کو کریدا۔ اس میں کچھ نہ تھا، میرے ہاتھ ہڈیاں بھی نہ لگیں۔"

"بلبلے" میں شعری نثر کا ایک خوبصورت ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے۔

"نیلے پہاڑ کی چوٹی پر بھی سفید دھواں اٹھا ہوا تھا۔ اوپر دور آسمان کی بلندیوں میں ہلکے، کالے رنگ کے بادل اٹھلا رہے تھے۔ بائیں طرف سورج خواب شب سے بیدار ہو کر انگڑائی

لے رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں بادلوں سے ہم آغوش ہو رہی تھیں اور درختوں کو چوم رہی تھیں۔"

جہاں تک افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے سنگھ کسی خاص موضوع کو اچھا یا برا نہیں سمجھتا۔ وہ ترقی پسند ہے، نہ رجعت پسند، وہ محض حقیقت پسند ہے۔ زندگی کا کوئی واقعہ چھوٹا ہو یا بڑا، بشرطیکہ اس میں "افسانویت" کے امکانات ہوں، اس کے افسانوں کا موضوع ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے آرٹ کو کسی مخصوص "ازم" سے وابستہ کرنے سے گریز کیا ہے، اور میرے خیال میں اس کے افسانوں میں جتنا تنوع ہمیں ملتا ہے اس کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ کسی موضوع کو ادبی لحاظ سے اچھوت نہیں سمجھتا۔

"تلاطم" میں اس نے تکنیک میں ایک نیا اور حیرت انگیز تجربہ کیا ہے۔ اس افسانے کا تانا بانا نفسی مدوجزر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اور شدت تاثرات کے لحاظ سے یہ افسانہ اس کا شاہکار گردانا جاسکتا ہے۔ بظاہر اس افسانے سے واقعات یکسر غائب ہیں لیکن اس امر کے باوجود ہیرو کی ذہنی الجھنیں اور احساسات کا طوفان ایک ایسی فضا قایم کر دیتے ہیں کہ افسانہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانی ذہن ایک ایسی دلچسپ بھول بھلیاں ہے جس میں ایک بار کھو جانے کے بعد کسی ماہر راہنما کی مدد کے بغیر راستہ کا کھوج لگانا ناممکن ہے۔

"لاعلاج مرض" ایک دلاویز مطالعہ ہے جس کا موضوع احساس کمتری ہے۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے چھوٹے چھوٹے مگر معنی خیز فقروں سے بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ سنگھ کے ہاں انسانی فطرت کا اچھا خاصا مطالعہ ملتا ہے۔ کہیں کہیں طنز و مزاح کے نشتر انداز بیان کی دلکشی میں خوبصورت اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے افسانوں "پیاس" اور "شکار" میں سماجی طنز کے بہت کامیاب نمونے ملتے ہیں۔

سنگر کو اگر کسی بات سے چڑ ہے تو وہ ہے سماجی بدعتیں یا کمزوریاں - اس لحاظ سے وہ منشی پریم چند کا ہمنوا ہے وہ "انقلاب" کی بجائے "اصلاح" کا زیادہ قائل ہے - بے جوڑ شادیاں، جہیز، صنف نازک کی ازلی غلامی اور بے زبانی، فرقہ وارانہ ذہنیت، جنسی جھجک، بھوک اور پیاس - اس قسم کے سماجی پھوڑوں اور ناسوروں کو وہ اپنے طنز کے تیر و نشتر سے کریدتا ہے تاکہ زہریلا مادہ پھوٹ پھوٹ کر بہہ نکلے اور ایک صحت مند اور توانا سماج کے پھلنے پھولنے کے امکانات ہو سکیں -

سنگر کا مطالعہ ابھی قدرے محدود ہے - یہ یقیناً اس لئے کہ سن کے لحاظ سے وہ ابھی نوعمر اور مشق کے لحاظ سے نو گرفتار ہے - اگر اس کا مطالعہ قدرے وسیع ہوتا تو یقیناً اس کی شہرت کی کہانی اس کی پہلی تصنیف سے شروع ہوتی - لیکن یہ مجبوری کچھ ایسی نہیں کہ مستقبل میں اس کو ایک عظیم افسانہ نگار بننے کی سعادت سے محروم کر سکے -

مجھے یقین ہے کہ اگرچہ وہ چھوٹی آنکھوں کا مالک ہونے کی وجہ سے فلم ایکٹر نہ بن سکا، تاہم سن اور تجربہ کی کچھ اور منزلیں طے کرنے کے بعد وہ ہماری زبان کا ایک قابل رشک اور لائق قدر افسانہ نگار ثابت ہوگا -

کنھیا لال کپور

راھی

ہمالیہ کی سربفلک دیواریں شیر پور کو اپنے دامن میں سنبھالے کھڑی تھیں، اور شیر پور کی وادی قدرت کی خوبصورتی کا بہترین نقش تھی اور اُس کی لاانتہا فراوانی کا بے نظیر عجوبہ۔ پہاڑوں کے بیچ، گندم کے بے شمار کھیتوں میں بٹا ہوا، ایک وسیع میدان پر پھیلائے کھڑا تھا۔ ان کھیتوں کی بے ضابطہ سی کیاریاں ہاتھوں کی اَن گنت لکیروں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ ان کو ملاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آدمی اور عورتیں پہاڑ کی چوٹی سے رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

کھیتوں کو ملاتی، ناگن کی طرح بل کھاتی ایک نیلی لکیر تھی، جس میں کہیں کہیں سفید رنگ کے اُبھرے ہوئے سے داغ تھے۔ یہ پہاڑوں میں بہتا ہوا راوی تھا۔ وہ جوانی کے نشے میں چور، ایک چلبلی حسینہ کی طرح بل کھاتا مست ناچ میں مگن تھا۔ اُس کی رگ رگ میں مستی بھری تھی۔ اُس کے جسم کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ اُس کے ناچ کی جھنکار ایک خوبصورت گیت بن کر شیر پور کی وسیع وادی پر چھا گئی تھی۔ ان گنت صدیوں سے وہ ناچ میں مست اور گیت میں مگن چلا آ رہا تھا اور ایک ہی دھن سے

اپنی منزل کی طرف، اپنے محبوب کی سمت بڑھا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو اُس میں ملا دینے کے لئے، اپنی ہستی کو مٹا دینے کے لئے۔ اُس میں کتنا عزم راسخ اور کتنا بیکراں جوش تھا۔ اس جاذبیت کی دُھن نے اُسے پاگل بنا دیا تھا۔ پہاڑوں کو کاٹتا، چٹانوں سے ٹکراتا اور پتھروں سے لڑتا وہ بھاگا جا رہا تھا اور نہ جانے کب سے۔ کتنے انقلاب آئے، کتنے ردّ و بدل ہوئے۔ ترقی اور تنزّل کی مدبیر ہوئی۔ مختلف شہنشاہوں نے سلطنتوں کے بیج بوئے، جن سے پیدا ہونے والے توانا درختوں کو زمانے کی تند ہوا نے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔ پھر نئے بیج، نئے درخت اور نئے طوفان۔ ایک لامتناہی سلسلہ۔ لیکن اس سب سے بے خبر، زمانے کی ہوا سے ناواقف، وہ بہا جا رہا تھا۔

اُس میں کتنی زندگی، کتنی روانی اور کتنی سرشاری تھی۔ لیکن شیرپور کے لوگوں کے لئے وہ صرف ایک دریا تھا، ہمیشہ بہنے والا اور اُن کے کھیتوں کو سیراب کرنے والا۔ لیکن اُس کی تندی ان کے لئے بلائے جان بھی بن جاتی تھی۔ اسے پار کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ تھوڑی سی چوک پار کرنے والوں کو لہروں کے رقص میں دھکیل دیتی اور اُن کا جسم چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔

اور چٹانیں کتنی مہیب اور خطرناک تھیں۔ صدیوں سے اپنی جگہ پر مستحکم، وہ اب بھی ایک گذشتہ زمانے کی یاد تازہ کر رہی تھیں، جب پتھر کے ہتھیار بنتے تھے، جن سے دشمن کا مقابلہ اور جانوروں کا شکار ہوتا تھا۔ وہ تھا پتھر کا زمانہ جب تہذیب کا آفتاب ابھی طلوع نہ ہوا تھا، جب ایک پتھر ایک وقت ایک ہی انسان کے لئے آفتِ جاں بن سکتا تھا۔ اب ہے ایٹم بم کا زمانہ، جب خورشیدِ ارتقا نصف النہار پر پہنچ چکا ہے اور ایک ایٹم لاکھوں جانداروں کے لئے پیغامِ مرگ لا سکتا ہے۔

صدیاں بیت گئیں۔ پتھر کے ہتھیار ماضی کی یادگار بن کر رہ گئے، لیکن ان کی سنگین مائیں اسی جگہ پر گرجی تندہی سے دریا کی راہ روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

لیکن وادی کے لوگ ندی کی تندی سے بے خبر، ماحول سے بے اثر زندگی بسر کر رہے تھے۔ شہر کے شور و غل سے دور اور قدرتی خوبصورتی سے بے بہرہ زندگی کی لہر میں بہے جا رہے تھے، جیسے سُست رفتار دریا کے ساتھ لکڑی کا کوئی تختہ۔ وسعتوں میں پھیلی ہوئی بے جان وادی میں صرف شاہ جی کی دوکان پر زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ دور بکھرے ہوئے گھروں سے پہاڑی لوگ، میلے اونچے پاجاموں، غلیظ پگڑیوں اور پھٹے ہوئے کوٹوں میں ملبوس، شاہ جی کی دوکان پر آ کر اس طرح ڈرتے ڈرتے سودا طلب کرتے جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔ اُن بے حس و حرکت لوگوں میں صرف شاہ جی ہی زندگی کے پتلے نظر آتے۔ اُن کی دوکان پنساری، منہیاری، اور بزازی کا مُرکّب تھی، جہاں سے اُن کی سب ضروریات مہیا ہوتی تھیں۔

اُس کا بس چلتا تو ساری عمر اُسی وادی میں کاٹ دیتا۔ لیکن زندگی میں سب کام انسان کی اپنی مرضی سے تو نہیں ہوتے۔ اُس کا پڑاؤ یہاں سے آٹھ میل دور تھا۔ اور وہاں سے موٹر میں سوار ہو کر اُسے واپس شہر جانا تھا، جہاں سے وُہ مہلت نکال کر قدرت کی برہنگی کا نظارہ کرنے آیا تھا۔ لاچار وُہ لوٹ پڑا۔ اس کے سامنے بلند پہاڑ تھے جن کو کاٹتی ہوئی ایک پگڈنڈی اس کے پڑاؤ کو جاتی تھی۔ وُہ اسی پگڈنڈی پر پاؤں رکھتا ہوا چل پڑا۔ وہ چلتا رہا۔ پگڈنڈی کھیتوں میں جا کر غائب ہو گئی، جہاں پہاڑی کاشتکاروں نے ہل چلا رکھے تھے۔ سورج اپنی

مسافت طے کر کے تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ قرب و جوار میں زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے، جیسے حالات نے سازش کر کے اُسے علیحدگی میں دھکیل دیا تھا۔ اس علیحدگی نے اُسے ہراساں کر دیا۔ وہ سیدھا پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ خار دار جھاڑیوں سے اُلجھتا، نوکیلے پتھروں سے ٹکراتا اور سُوکھی گھاس پھنستا اوپر چڑھتا گیا۔ اُسے اُمید ہوتی کہ اُس پہاڑ پر پہنچ کر اُسے راستہ نظر آئیگا لیکن اُس کے بعد دوسرا پہاڑ نظر آتا اور پھر ایک اور...... ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ...... دور سے ایک آواز اُس کے کان میں پڑی۔ کوئی گا رہا تھا۔ وہ آواز کی طرف بڑھا۔ سامنے ڈھلان تھی۔ وہ پھلانگیں لگاتا ہوا اُس کی طرف چلا۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے پگھلے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سنبھالے ایک پہاڑی چشمہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا، جیسے کوئی قزاق مالِ مسروقہ لے کر چلے چشمے کے کنارے ایک گھڑا پڑا تھا۔ اُس کے پاس ایک بڑی کشادہ چٹان پر پیٹھ کے بل لیٹی ایک دوشیزہ مسحور کُن انداز سے ایک سُریلی دُھن الاپ رہی تھی۔ وہ وہیں رُک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اے میرے محبوب میں کب تک تمہارا انتظار کروں؟

قدرت کی خوبصورتی مجھے پاگل بنا رہی ہے۔

پہاڑوں کی چوٹیاں سفید برف کا چولا پہنے کھڑی ہیں۔

سورج کی شعاعیں اُن سے ہم آغوش ہو رہی ہیں۔

چیلوں کے درخت نشے میں جھوم رہے ہیں۔

اور چشمہ والہانہ انداز سے ناچ رہا ہے۔

"اے میرے محبوب! میں کب تک تمہارا انتظار کروں؟"

نہ جانے کیوں اُس کے ہونٹوں سے آہ نکل گئی جس نے اُس دوشیزہ کو چونکا دیا۔ پردیسی کو دیکھ کر وہ جھجکی لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور گھڑا اُٹھائے چشمے کے کنارے پہنچی۔ اُس کی آنکھیں اس مجسمۂ حُسن سے اُلجھ گئیں۔ متانت اور معصومیت سے اس گلابی چہرے پر۔ سُرمئی آنکھیں اور تنی ہوئی بھنویں مصورِ ازل کی نقاشی کا بہترین نمونہ تھیں۔ قدرت کی آغوش میں پلی ہوئی، دھوکے اور فریب سے مُبرّا، وہ اس خوش اندام اور زلینو چہرہ دوشیزہ کے قرب سے لطف اندوز ہونے لگا۔ یکایک ایک دھیمی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

"کہاں سے آئے ہو مُسافر؟"

"شیر پور سے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"چھاؤنی!"

"کہاں شیر پور اور کہاں چھاؤنی کا راستہ۔ کیسے آپھنسے؟"

"راستہ بھٹک کر، پُرخار جھاڑیوں سے اُلجھتا، خطرناک پہاڑی راستوں میں ڈگمگاتا اِدھر آنکلا ہوں۔"

وہ محوِ حیرت ہو کر اُس کا منہ تکنے لگی۔ کیا وہ سچ مچ راستہ بھول کر ریچھوں اور چیتوں سے پُر، گھنے جنگلوں اور ڈراؤنے پہاڑوں میں سے گھومتا آیا تھا؟ وہ ان خطرناک راستوں سے واقف تھی۔ راستہ بھٹک کر شام کے وقت ایک پردیسی ان جنگلوں میں گھومتا رہا اور سیدھا پہاڑ پر چڑھتا رہا۔ ایک غلط قدم،

ایک بھول، اُسے دور نیچے پہاڑ کے عمیق غاروں میں لے جاسکتی تھی، جہاں صدیوں کی بھوکی چٹانیں، اپنے تیز دانت نکالے اُس کا خون چوسنے کو تیار کھڑی تھیں۔ وہ کانپ اُٹھی، اُس کے اندر انسانی محبت کا جذبہ لہریں مارنے لگا۔ کاش وہ اُس کی مدد کر سکتی۔

تھکاوٹ سے چور اور بھوک سے نڈھال مسافر چٹان پر بیٹھ گیا۔ دوشیزہ نے اُس کے پژمردہ چہرے کو دیکھا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پھر نہ جانے اُسے کیا سوجھی۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور آہستہ سے بولی۔

"مسافر! وہ جو سامنے گھر دکھائی دیتا ہے، وہاں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ تم وہاں سستا لینا" اور اتنا کہہ کر آن کی آن میں غائب ہو گئی۔

بادلِ ناخواستہ، اپنی قسمت کو کوستا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ایسے کٹھن سفر میں اس حسینہ کی ملاقات نے اُسے گوناگوں راحت بخشی تھی۔ اور وہ ایک خواب کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی، ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ سفر کی تھکان اور بھوک کی شدّت اُسے اور بھی پریشان کر رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ دور مغرب میں چیلوں کی قطار کے پیچھے سورج نے آسمان میں آگ لگا رکھی تھی۔ وہ اب بھی ڈوبنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن نظامِ قدرت کی بے جا بندش نے اُسے آگ بگولا کر دیا۔ سنہری سُرخی اُفق پر پھیل گئی۔ اُونچے برفیلے پہاڑوں پر اس کے سائے جا پہنچے۔ سنہری کرنیں برف سے ہم آغوش ہو گئیں۔ برف کا چہرہ سُرخی مائل ہو گیا۔ جیسے کسی حسینہ کے خوب صورت چہرے پر شرم سے سُرخی کی لہر دوڑ جائے۔ قدرت خوب صورتی کی انتہا پر تھی۔ لیکن وہ اُس سے لُطف اندوز نہ ہو سکا۔ فضاؤں کو چیرتا ہوا ندی کا نغمہ اب بھی اُس کے کان میں گونج پیدا کر رہا تھا لیکن اُس کے دل میں گداز پیدا نہ کر سکا۔ زندگی اُس کے لئے پھیکی اور بے رس بن گئی تھی

اور سامنے تھی چڑھائی۔ سیدھی اونچی یوگی کے مارگ کی طرح کٹھن۔ ایک غلطی

اُس کی شمع زندگی بجھا سکتی تھی۔ کیا ہے زندگی بھی ؟ چوراہے پر رکھا ہوا چراغ۔ تھوڑی

چڑھائی کے بعد اُسے سانس لینے کے لئے رُکنا پڑا۔ اُس نے دیکھا، نیچے وادی میں راوی

محو خرام تھا۔ اُس کے کنارے سر اُٹھائے ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ ترچھا سا۔ اُس پر

جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اور جنہیں بکریاں چر رہی تھیں۔ پاس ہی اس پہاڑی پر

لڑکے بیٹھے تھے۔ اسے ان چرواہوں اور ان کی بکریوں پر ترس آگیا۔ وہاں سے

پھسلنا کتنا آسان تھا۔ اور نیچے پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا ہوا راوی بہہ رہا تھا۔

لیکن نہ تو وہ گرے اور نہ اُن کی بکریاں۔ وہ قدرت کے کمال پر حیران ہو گیا، جو

کھلے میدانوں اور گھنے جنگلوں میں، دشوار گزار گھاٹیوں میں اور برف سے ڈھکے ہوئے

پہاڑوں پر جانداروں کو اپنے مطابق بنا لیتی ہے۔ وہ آگے بڑھا۔ لڑکی کے خیال نے

اُسے پریشان کر دیا۔ اُسے اس پر غصہ تھا، جو اس طرح دھوکہ دے کر، ایک موہوم

اُمید دلا کر بھاگ گئی تھی۔ اُس نے سوچا۔ سچ مچ پہاڑی لوگوں سے وفا کی امید غلط ہے۔

اوپر پہاڑ پر ایک مکان نظر آرہا تھا۔ منزل ابھی دور تھی اور دن ڈھل رہا تھا۔ اُس نے

ہمت باندھی اور تیز قدم اُٹھاتا ہوا مکان کے پاس جا پہنچا۔ وہاں پہنچکر اُسے کچھ ڈھارس

ہوئی۔ شاید وہاں کچھ کھانے کو مل سکے۔ وہ پیسے دے سکتا تھا۔ یہ لوگ غریب تو ہوتے

ہیں۔ اور غربت اور لالچ میں کتنی گاڑھی چھنتی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ مکان کا نچلا کمرہ

بند پڑا تھا۔ اوپر والی منزل میں بتی جل رہی تھی جو اس سونے جنگل میں اسی طرح معلوم

دے رہی تھی جیسے اندھیری رات میں بادل سے گھرے ہوئے آسمان میں صرف ایک

تارا چمکتا ہو۔ وہ نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور پھر لیٹ گیا۔ بھوک نے اُسے نڈھال

کر دیا تھا۔

"کون ہے؟" ایک آواز نے اُسے پکارا۔

"راہی۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"شیر پور سے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"چھاؤنی۔"

"اس وقت؟" اُس آواز نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ نہ سمجھ سکا کہ اس میں حیرانی کی کیا وجہ ہے اور اس وقت شیر پور سے آنے میں کیا ہرج ہے۔ اُس نے سوچا کہ پہاڑی لوگ ڈرپوک ہوتے ہیں۔ لیکن اُسے خیال آیا کہ منزل ابھی باقی ہے اور پیٹ خالی ہے۔ اُس نے بیٹھتے ہوئے مالک مکان سے پوچھا کہ کیا اس گرد و نواح میں کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟ "نہیں!" اور اس نہیں نے اُسے مایوسی کے سمندر میں دھکیل دیا۔ اُس کی آنکھیں شاید چکرا رہی تھیں اور اُسے اپنا ماحول گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے سُنا وہ کسی کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"لوسن کی ماں! مجھے یاد آ گیا۔ ایک ضروری کام سے مجھے گتاکیان جانا ہے۔ زمین کا معاملہ ہے۔ شاید دیر سے واپس آؤں یا صبح ہی لوٹوں۔" اور گرد و نواح کے جنگلوں اور پہاڑوں کی خاموشی پر اس پہاڑی زمیندار کی آواز چھا گئی۔ مسافر کی یہ امید بھی جاتی رہی۔ منزل ابھی دور تھی۔ بھوتوں کے سائے کی طرح رات سر پر کھڑی تھی۔ آج اُس کے لیے شکستوں کا دن تھا۔ اُس ظالم لڑکی کی بے اعتنائی نے اُس کے

دل کو زخمی کر دیا تھا۔ شاید وہ اُس زخم کو بھول جاتا اگر زمیندار گنّا تیاں جانے کی بجائے اُسے کچھ کھانے کو دیدیتا۔ اُس کے رُوکھے پن نے اُس کے زخموں کو تازہ کر دیا۔

پھر ایک بُڑھیا اُس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہاتھ میں گلاس سنبھالے اور دوسرے میں روٹی۔ اور بولی "بابوجی کھاؤ۔ اور یہ رہی چائے۔ لوسن کہتی ہے کہ اسوفت کھانا نہیں کھائے گی۔ اس پر آپ کی مُہر لگی ہے۔" اسے خواب کا گمان ہوا۔ لوسن، چائے اور مہر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کچھ گورکھ دھندا سا۔ لیکن بوڑھی عورت پھر بولی۔

"لوسن میں پانی لانا بھول گئی۔ یہ لوگ بغیر ہاتھ دھوئے کھانا نہیں کھاتے۔ جلد ایک گلاس میں پانی لاؤ۔"

اور نہ جانے کہاں سے وہی دوشیزہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ تھی لوسن، جنگل کی دیوی، بہشت کی پری۔ چائے اور روٹی کو بھول کر وہ مبہوت سا اس کی طرف دیکھنے لگا وہ بولی۔

"مسافر! اب تو کھاؤ۔" اور پھر کہنے لگی "کہاں جاؤگے اتنی رات گئے، یہیں بیٹھ رہو۔ بابو اب صبح سے پہلے نہیں آئے گا۔" کتنی تمنائیں تڑپ رہی تھیں اس التجا میں، کتنی آرزوئیں سسک رہی تھیں اس پکار میں تو وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ پردیسی مسافر، میدانوں کا باسی، پہاڑوں کے رسوم سے بے بہرہ، یہاں کی دنیا سے بے نیاز، سامنے تین میل پرے دوسرے پہاڑ پر روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یہ تھی اس کی منزل۔ دیاروں کی اوٹ میں چاند آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ جنگل خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اور یہ ساتھی لوسن جس میں چاند کی خوبصورتی اور دیاروں کی مہک بھری تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ لوسن اور منزل۔ اُسی وقت دور سے ایک آواز آئی۔ لوسن کے باپ کی، زمیندار کی،

وہ گنگا لیاں سے لوٹ آیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ لوتن اس کی گرج سن کر بھاگی۔ بڑھیا بھی نہ رک سکی۔ اور زمیندار مسافر سے کہہ رہا تھا" ہاں وہ سامنے پہاڑ کی روشنی ہی تمہاری منزل ہے۔ سیدھے سڑک کے ساتھ چلے جاؤ تیسرے میل پر بائیں طرف کو مڑ جانا۔ بے بے"
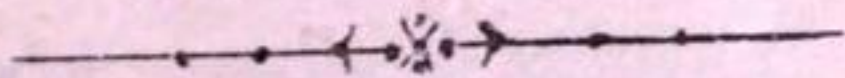
شکست

موسم بہار میں پھولوں سے بھرا ہوا باغ اپنے جوبن پہ تھا جیسے گہنوں سے لدی ہوئی نئی نویلی دلہن ہو۔ نرگس ہمیں نظامِ قدرت کی ابدیت اور فنا کا سبق سکھاتی۔ بہار میں سورج کی روشنی اُسے زندگی بخشتی اور گرمیوں میں اُس کی تمازت اُسے جھلس دیتی۔ باغیچہ میں کھڑے مالی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گلزارِ جنت میں حبشی کھڑے ہوں۔ اُن کے گندہ کپڑے اور افسردہ چہرے قدرت کی خوش پوشی اور نرگس کی خوش روئی سے کتنے متضاد تھے۔

"اندرا۔ تمہاری تازگی نرگس کی شگفتگی سے کتنی مشابہ ہے۔" میں نے ایک دن گھاس پر لیٹے ہوئے کہا

"ایسا نہ کہو۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جانتے نہیں کہ نرگس کا چراغِ زندگی ایک دن سے زیادہ نہیں جلتا۔" وہ آہ بھر کر بولی۔ اور اُس کی آہ میں ہزاروں نالے سسکیاں بھرتے اور لاکھوں

فضائیں کراہتیں۔ جب نرگس کا پھول توڑ کر میں اُس کے بالوں میں لگاتا تو وہ دل مسوس کر
رہ جاتی اور کہتی " دیکھتے نہیں، کس طرح ہمارا جذبہ خود غرضی دوسروں کی پامالی کے مترادف
ہوتا ہے "

پھولوں کی سیج کے پاس بیٹھے ہم گھنٹوں باتوں میں منہمک رہتے۔ ہمیں گمان
گزرتا کہ ابدیت ہماری زندگی کا ناگزیر پہلو ہے۔ ہمارے اختلاط میں اُن گنت صدیوں
کی وسعت پائی جاتی تھی۔ ہماری دو روحیں تھیں، ان کی ایک ہی منزل تھی اور ایک ہی
راستہ ـــــ صدیوں سے منزل پر پہنچنے کی دُھن میں ہم گامزن تھے۔ لیکن سفر
ابھی باقی تھا، منزل ابھی دُور تھی۔ ایک دائمی احساس کا غلبہ کہ اندرا کی رفاقت
سفر کی صعوبت کو کم کرنے میں کتنی معاون تھی مجھے گوناگوں راحت بخشتا۔ جب اُس کے
نگیوں سے سفید اور گلِ انار سے سرخ گالوں پر مسکراہٹ ناچتی تو ایسا معلوم ہوتا
جیسے سفید برفیلے پہاڑ پر ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں رقص کر رہی ہیں۔ اُس کے
ماتھے پر لال بندی ایسے معلوم دیتی تھی۔ گویا آدھے چاند پر چھوٹا سا لال نشان ہو
جب میں والہانہ انداز سے کہہ اٹھتا " اندرا۔ قدرت نے تمہیں اتنا حسین کیوں بنایا
تو اُس کے گلابی رخسار تمازت سے چمک اٹھتے اور اس کی آنکھوں میں ڈورے پھیل

ہماری دوستی کا آغاز بچپن کے دھندلکے کہروں سے ہوا تھا۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا کہ
ہم لاانتہا زندگیوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ لافانیت ہماری یگانگت کا لازمی جزو
معلوم ہوتی تھی۔ ہم زندگی کے میدان میں دوش بدوش چل رہے تھے۔ سکول ہم
اکٹھے جاتے۔ کمرے میں اکٹھے بیٹھتے۔ اور کھیل کود میں بھی جدا نہ ہوتے تھے۔ دوسرے
لڑکے لڑکیوں کو یہ بات نہ بھاتی، لیکن زبان درازی کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی

میں سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ ایک دن اُسے اکیلی چھوڑ کر مجھے کچھ دیر کے لئے گھر جانا پڑا۔ واپسی پر میں نے اُسے صحن میں پیپل کے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ میری آہٹ پاکر اُس نے آنسو پونچھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ میری حیرانی اور گھبراہٹ غصّے میں تبدیل ہوگئی جب اُس نے مجھے بتایا کہ دینیش نے اُسے چھیڑا تھا۔ اُسے وہیں چھوڑ کر میں کلاس روم میں گھس گیا جیسے بھیڑوں کے گلّے میں کوئی بھیڑیا گھس جائے، اور جاتے ہی دینیش پر ٹوٹ پڑا۔ مسلسل گھونسوں کی بارش نے اُسے ہراساں کر دیا۔ اُس کی آنکھیں سوجھ گئیں۔ گال سرخ ہوگئے اور وہ حواس باختہ ہوگیا۔ آخر وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے سکول سے نکال دیا گیا۔ اس کا مجھے مطلق غم نہ تھا' نہ اندرا کو سکولوں کی کمی ہی کیا تھی؟

کالج میں ہمیں ایک اور ساتھی مل گیا۔ مسکراتا ہوا کملیش ہماری زندگی میں دبے پاؤں اس طرح آکر مل گیا تھا جس طرح ایک موسم دوسرے میں گم ہوجاتا ہے۔ قدرت نے اُسے خوبصورت چہرہ اور سڈول جسم عطا کیا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا اور جماعت میں کوئی لڑکا اُس کے آگے دم نہ مار سکتا تھا۔ صرف میں ہی اُس سے لگا کھاتا تھا۔ امتحان کے نتیجے کے بعد ہم دونوں میں رقابت چل نکلی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ہماری چشمک دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اب ہم کالج میں اکٹھے رہتے۔ ہماری دوستی سارے کالج کے لئے رشک کا باعث تھی۔ تعلیم اور مباحثوں میں ہم کالج میں پیش پیش رہتے۔

ہم تینوں زندگی لہر میں بہے جارہے تھے۔ ہماری کشتی ساکن پانی پر

چل رہی تھی، اُسے نہ طوفان نے پریشان کیا تھا اور نہ گرداب نے۔ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی ایک خوبصورت اصلیت ہے، جس کی نئی تمنائیں، تازہ آرزوئیں اور جدید جستجوئیں ہمیں نامعلوم علاقوں میں کھینچے لئے جا رہی ہیں۔ جیسے زندگی کی تمام شاہراہیں ہمارے سامنے کھلی پڑی ہیں۔ منزلِ مقصود کے حصول کی تمنا ہمیں اتنا نہیں اُکسا رہی تھی جتنا نئے راستے دریافت کرنے کی دھن۔ کملیش کی آمد سے ہماری محفل میں گرمی آ گئی تھی، کیونکہ اُسے مباحثہ کا شوق تھا اور یہ شوق اندرا میں بھی زور پکڑ گیا تھا۔ جب ہم باغ کی سیر کو جاتے تو خاموشی سے مشاہدۂ قدرت نہ کرتے کملیش ہر بار کوئی نیا نکتہ چھیڑ دیتا۔ ایک دن نرگس کو دیکھ کر وہ بولا۔

"کاش اس کی شگفتگی دائمی ہوتی۔"

"تب اس کی قدر و منزلت بھی اُڑ جاتی۔" اندرا نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ تغیر ہی زندگی کا اہم ترین سانچہ ہے اور نظامِ قدرت کا لازمی اصول۔"

"آپ کا خیال ہے کہ یہ جذبہ ایک امیر کو غربت کی تمنا پالنے پر بھی مجبور کرتا ہے؟"

"بیشک، اور یہی نہیں، اپنے لافانی ڈرامہ " مین اور سپر مین " میں برناڈشا نے لکھا ہے کہ اس جذبے کے ماتحت دائمی بہشت کو چھوڑ کر انسان بصد خوشی دوزخ کی دہکتی آگ میں کودنا پسند کرتا ہے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ شا جھک نہیں مار سکتا؟"

"لیکن شا کی اس حقیقت نگاری کو میں اصلیت کے عمیق مشاہدے پر مبنی پاتی ہوں۔ آپ نہیں دیکھتے کہ پیدائش سے لیکر موت تک انسان کے ارتقاء میں کتنا

تغیر رونما ہوتا ہے - اور ایک ہی انسان میں بیک وقت کتنی ذہنی کیفیات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔"

"اگر بالفرض اس بات کو صحیح تصور کر لیا جائے۔" کلیتش بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "تو سماج انسان کو ایک ہی رفیقۂ حیات سے چمٹا رہنے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ کیا تبدل کا اصول یہاں عائد نہیں ہوتا؟"

"انسانی سماج کے قواعد قوانین قدرت کی تقلید پر مبنی نہیں۔"

"بھلا کیوں؟"

"ایسا کرنے سے سماج میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔"

"میں اسے تنگ نظری تصور کرتا ہوں۔ اس نظریے نے زندگی سے رومان کا فقدان کر دیا ہے۔"

"رومان کا نہیں، جنسیات کا۔" اندرا جوش سے بولی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کلیتش کہنے لگا۔

"رومان کے بغیر زندگی میں لطافت ہی کیا رہتی ہے؟"

"لیکن یہ لطافت کتنی عارضی ہوتی ہے۔ جوانی کے چند سالہ چکر تک محدود۔"

"کاش ایسا نہ ہوتا اور انسان ہمیشہ جوان رہتا۔"

"ڈورین گرے نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی اور تم جانتے ہو کہ اسکا حشر کیا ہوا تھا؟"

"ڈورین گرے صرف آسکر وائلڈ کے تخیل کی تخلیق ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تخیل ہی ہر خواہش کا خالق ہوتا ہے۔ اور ڈورین گرے، ان ہزارہا نوجوانو

کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو جنسیات کو رومان اور محبت کا غلط نام دیکر جذبۂ دائمی کے سنہرے خوابوں کی ناکام پرورش کرتے ہیں۔ تکمیلِ جنسیات میں سچی خوشی کی اُمید کرنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا سوکھے جنگل میں میٹھے پانی کے چشمہ کی تلاش!"

کملیش خاموش ہو گیا۔ اس کی شکل ظاہر کر رہی تھی کہ آندرا کا جواب اُسے پسند نہ آیا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا کاش یہ بات غلط ہو۔

ایک بار آندرا کی طویل بیماری کے باعث ہمیں کالج سے لمبی چھٹی لینا پڑی ہم دونوں نے اپنے کئی دن رات اس کی خدمت میں صرف کر دیے اور آنکھوں آنکھوں میں راتیں کاٹیں۔ آندرا کے غسلِ صحت کے موقع پر جو دعوت دی گئی وہ اب بھی میرے خیالات کی سطح پر تیرتی ہے۔ شہر کے معزز آدمی، پری چہرہ دوشیزائیں اور ماہ رُخ نازنینیں اس دعوت کو زینت دے رہی تھیں۔ ان کی گلابی، بسنتی، ارغوانی اور صندلی رنگ کی ساڑھیاں ایسے معلوم دیتی تھیں جیسے باغ میں اتنے ہی رنگ کے پھول کھلے ہوں۔ آندرا ان سب میں ممتاز تھی۔ جیسے سجی ہوئی اور خوبصورت لونڈیوں کے درمیان کوئی مہارانی۔ بیماری کے بعد اُس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ جس طرح گہن میں رہ کر چاند۔ اس کے حسن پر اور بھی شباب آ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ والی میز پر کچھ مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے اچانک ان میں سر گوشیاں ہونے لگیں۔ لیکن اُن کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک نے پوچھا

"اشوک اور آندرا کے ساتھ وہ نوجوان کون ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے؟ وہ اشوک کا عزیز دوست کملیش ہے۔"

"بلا کا خوبصورت ہے۔"

"اور اندرا ابھی تو دیکھو جیسے سورگ کی اپسرا ہو۔"

"کیا خوب جوڑی ہے!"

میں اور کملیش مسکرا دیئے۔ اندرا جھینپ سی گئی۔

گرمیوں میں ہم دریا کے کنارے پہنچتے اور اپنی کشتی کو پانی میں ڈال دیتے۔ دریا کی زندگی کتنی سبق آموز ہوتی ہے۔ کتنے معمولی آغاز سے اُس نے اتنی وسعت حاصل کی تھی۔ زندگی کے آغاز میں ہی خطرناک مصائب اس کے راستے میں حائل ہو گئے تھے۔ لیکن خوفِ انجام سے بے پروا اپنے راستے پر گامزن ہوتے ہوئے، اس نے چٹانوں کی سخت چوٹوں اور پتھروں کے سنگین واروں کو اپنی چھاتیوں پر سہا۔ اس قوت برداشت نے اس کے ارادوں میں پختگی اور خیالات میں بلندی پیدا کر دی۔ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے نالے اور بیشمار چھوٹی چھوٹی ندیاں اس کے اوصاف کی گرویدہ ہو کر اس کی طرف کھنچ آئیں اور جذبۂ ایثار کے زیرِ اثر اس کے راستے میں بچھ گئیں۔ جاذبیت کے اس بے مثال جذبے نے دریا کے دل کی گہرائیوں میں ہیجان برپا کر دیا۔ اُس نے اپنی انفرادیت اپنے محبوب کے قدموں پر نثار کرنے کا عزم کر لیا اور نالوں کی تقلید کرتا ہوا سمندر میں جا ملا۔ دلی کوفت کو ہلکا کرنے کے لئے ہم پانی میں غوطہ لگاتے لیکن کامیابی کی امید لئے بغیر۔ گو جسم کی خارجی گرمی کچھ دیر کے لئے روپوش ہو جاتی، لیکن ذہنی جلن اور دماغی کلفت کو دور کرنے کے لئے پانی کی ٹھنڈک ناکافی تھی۔

کملیش کی آمد نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اب مجھے ہر وقت اندرا کی فکر نہ ہوتی۔ میری عدم موجودگی میں وہ گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا گفتگو یا بحث میں مشغول رہتا۔ ایک دن میں کمرے میں داخل ہوا تو شادی کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ کملیش کہہ رہا تھا۔

"میں تو اس بات کا پوری طرح معتقد ہوں کہ شادی محض ایک ڈھونگ ہے۔"

"کیا آپ، اس کو ایک مقدس رشتہ تصوّر نہیں کرتے؟" اندرا نے جوش سے پوچھا

"ہرگز نہیں۔" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تمھارے مسئلہ تغیّر و تبدّل کے مطابق انسان فطرتاً اس رشتے کو نبھانے کے ناقابل ہے۔ وہ ایک ازدواج رشتہ سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا۔ لازم ہے کہ کچھ دیر کے بعد وہ نئی شاہراہوں کی تلاش کرے۔"

"عورتوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آزادی سب کے لئے یکساں ہونی چاہیئے۔"

"آپ اپنی بیوی اور بہن کو یہ آزادی دینے سے گریز تو نہ کریں گے؟"

"لیکن ......"

"آپ میرے سوال کا 'ہاں' یا 'نا' میں جواب دیں۔" اندرا نے تن کر کہا۔

"لیکن ہماری بہنیں یا بیویاں اس کے ناقابل ہو جاتی ہیں۔ شادی کے بعد اُن کی جوانی ختم ہو جاتی ہے اور اُن کا رومان مر جاتا ہے۔"

"اور اس کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ آدمی کے بنائے ہوئے قوانین اب تک عورتوں کو وفاداری اور شوہر پرستی کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔

مقررہ راستہ سے ہٹی ہوئی تھوڑی سی چوک بھی ان پر سماجی قہر کے بند کھول دیتی ہے۔ وہی سماج جو آدمی کے ناپاک ترین گناہوں کو شرمناک طریقوں سے چھپا لیتا ہے عورتوں کی معمولی سی خطا کو درگزر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔"

"درحقیقت ہمارا ملک ابھی اس سماجی انقلاب کے لئے تیار نہیں ہوا۔" کملیش نے جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ترقی کی طرف اٹھایا ہوا ایک معمولی قدم سماج کو ہلا دیتا ہے۔"

"انقلاب نہیں گراوٹ۔ ترقی نہیں تنزّل ہے۔" اندرا جوش میں آکر بولی۔ "کیا مغربی ممالک میں اس آزادی نے وہاں کے سماجی مسائل کا واحد حل ڈھونڈ نکالا ہے؟ کیا اس کے زیرِ اثر وہاں خوشی کا دور دورہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس ان ممالک میں اس جنسی آزادی نے سماج میں انتشار پیدا کر رکھا ہے۔ آئے دن طلاق کے واقعات وہاں کے باشندوں کی ذہنی کشمکش اور دلی کلفت کے شاہد ہیں۔ صدیوں کی آزادانہ روش کے بعد آج وہاں کے لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے سماج کی خامیاں ہی ان کے روحانی سوز کا باعث ہیں۔"

اندرا کی اس لاجواب دلیل نے کملیش کو خاموش کر دیا۔ متحرک پنکھے کی طرف دیکھ کر وہ محسوس کرنے لگا کہ پنکھے نے ہوا کی تخلیق نہیں کی ہے۔ صرف اُس کمرے میں موجود ساکن ہوا کو جنبش میں لے آئی ہے۔ خیالات کا تانتا اس کے دماغ میں پہلے بھی موجود رہتا تھا۔ اندرا کی موجودگی ان خیالات کو سطح پر لے آتی تھی اور وہ اُن کے تانے بانے میں اُلجھ جاتا۔ ایک ذہنی کشمکش اُسے پریشان کر دیتی اور چہرہ اس کی دماغی اُلجھن کا گواہ ہوتا۔

ساون کی بہاروں کا لطف ہم اکٹھے مل کر اُٹھاتے ۔ کالی گھنگھور گھٹائیں شفاف آسمان کو اس طرح چھپا لیتیں جس طرح گناہ کے جالے روح کی پاکیزگی کو چھپا لیں ۔ کائنات کا ذرہ ذرہ قدرت کی فیاضی کے گیت الاپنے لگتا ۔ موسلا دھار بارش میں ہم اس طرح گھومتے پھرتے جیسے دلوں سے غموں کی گرمی نکالنا مقصود ہو ۔ جب ٹھوکر کھا کر ہم میں سے کوئی گر پڑتا تو ہمارے قہقہے موسلا دھار بارش میں گم ہو جاتے اور بارش کی تیزی انہیں زمین پر پٹخ دیتی جیسے قسمت کسی بد نصیب کی تمناؤں کو پچھاڑ دے ۔ پھر آموں کے کنجوں میں بیٹھ کر ہم قدرت کی دوشیزگی کا لطف اُٹھاتے ۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ہم وقت کے تیز ہوائی جہاز پر سوار بلند فضاؤں میں اُڑے جا رہے ہوں زمین والوں کے رنج و اَلم سے دُور ہم اپنی پرواز میں محو تھے ۔ ہمیں حیرانی تھی کہ دنیا دار کس طرح روزمرہ کے جھنجھٹ میں اُلجھ کر زندگی کی کلفتوں کو سہے جا رہے ہیں ۔ ہمیں اُن کے حال پر ترس آ جاتا ۔ کاش وہ بھی بلندیٔ پرواز کا حظ اٹھا سکتے اور ان فضاؤں کی لطافت کا مزہ لے سکتے ۔ یہ خیال ہمیں چھو تک نہ گیا تھا کہ اگر زمین والے ہماری بلندیوں تک نہ پہنچ سکتے تھے تو ہمیں ان کی پستیوں کو چھونا ہوگا ۔

وقت گزرتا گیا ، ہوائی جہاز کی تیزیٔ پرواز کی طرح ۔

حسبِ معمول میں ایک دن اِندرا کے کمرے میں گیا ، وہ وہاں نہ تھی ۔ انتظار کرنے کے خیال سے میں نے وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا ۔ میری نگاہ اُس کی میز پر پڑی جس پر ایک بند لفافہ رکھا تھا ۔ اُس پر لکھا تھا : "مہتا رے نام" ۔ میں نے جلدی سے کھول کر اُسے پڑھا ۔ خط پڑھتے ہی میری ٹانگیں ڈگمگانے لگیں ۔

اور میں چکر کھا کر زمین پر گر پڑا مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارا کمرہ متحرک ہو۔ زمین گھوم رہی ہو اور ساری کائنات چکر میں ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ دُور مرگھٹ میں ایک چِتا جل رہی ہے۔ لوگ اُس پر لکڑیاں ڈال رہے ہیں اور گھی پھینک رہے ہیں۔ آگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُس چِتا میں میری تمام آرزوئیں جل رہی ہیں۔ اور میری تمام تمنائیں جُھلس رہی ہیں آہستہ آہستہ لوگوں کی بھیڑ کم ہوگئی۔ شعلے مدّھم ہوگئے اور آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ میں نے راکھ کو کریدا اُس میں کچھ نہ تھا۔ میرے ہاتھ ہڈیاں بھی نہ لگیں۔

کملیش اور اندرا کسی نامعلوم جگہ کو چلے گئے تھے، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے لئے، ماہ عسل منانے کے لئے۔ اُن کا سراغ لگانے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ اگر وہ چوروں کی طرح بھاگ نکلے تھے تو میں سپاہیوں کی طرح اُن کا کیوں تعاقب کروں؟

بچپن سے میں نے ایک ہی اُمید کو پالا تھا، اور ایک ہی آرزو کو ہوا دی تھی۔ کملیش نے آکر اُسے ملیا میٹ کر دیا۔ ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے پرندے نے گھونسلا بنایا تھا لیکن طوفان کے ایک سخت جھٹکے نے اُسے تباہ و برباد کر دیا۔ میری حالت اُس آدمی کی طرح تھی جس نے ایک ایک پائی جوڑ کر دولت اکٹھی کی ہو اور چور آکر اُس پر ہاتھ صاف کر گیا ہو۔

میں جانتا تھا کہ کملیش کی ذہنی نمود کے ساتھ ساتھ اُس کی نفس پرستی بھی بڑھتی گئی تھی، خواہشات پر قابو پانے کی اس نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ ایسا تیز رفتار گھوڑے پر سوار وہ پہاڑ کی ڈھلان پر بھاگا جا رہا تھا۔ لگام اُس کے ہاتھ سے

نکل چکی تھی۔ گر کر مر جانے کے دکھ سے بڑھ کر تیز سواری کا مزہ اُسے اُکسا رہا تھا۔ وہ گھنٹوں اندرا اور مجھ سے اس بارے میں بحث کرتا لیکن مجھے خواب میں گمان نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اندرا ہی کو پھانس لے گا۔ وہ حسین تھا اور لڑکیوں کو جیت لینے کا اُس میں ایک خاص وصف تھا۔ اُس کی خوبصورتی اور ذہانت اور حُسنِ گفتار انھیں اس کی طرف کھینچ لیتے۔ لڑکیاں اُس پر مرتی تھیں۔ اور وُہ کہا کرتا کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اُس کی دو تین بار رسگائی ہو چکی تھی۔ اُس نے ایک ایک کر کے سب کو جواب دیدیا تھا کیونکہ بعد ازاں اُن کے نقائص حُسن کی بھنک اُس کے کانوں تک پہنچتی رہی۔ میں کہتا کمبخت شادی کے بعد بیوی کو بھی چھوڑ دو گے کیونکہ حُسن ظاہری تو تھوڑے عرصے کا مہمان ہوتا ہے۔ وُہ خاموش رہتا۔ اُس کے چہرے کے نقوش اس بات کا واضح اعلان کرتے کہ اُس کے ذہن میں حُسن کی تصاویر گردش کر رہی ہیں۔

اب میری زندگی کی چہک رخصت ہو چکی تھی اُس کا لطف عنقا ہو چکا تھا۔ میری حالت اُس پرندے کی طرح تھی جسے شکاری نے اُس کی رفیقۂ حیات سے جُدا کر نوچ کر پھینک دیا ہو، اور جو سسک سسک کر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہو۔ میں اُس سوکھی ٹہنی کی طرح تھا جسے ہوا کا ایک تُند جھونکا درخت سے علیحدہ کر پھینکے۔ کبھی مجھے اندرا کے رویہ پر افسوس ہوتا۔ بھلا اُسے چوری سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وُہ میری رضامندی چاہتی تو شاید میں انکار نہ کرتا۔ اور چھاتی پر پتھر رکھ کر بھی اُس کی بات پوری کرتا۔ تاہم ایک دُور کی اُمید میرے دماغ کے کسی کونے میں اٹکی رہتی کہ چاند عارضی گہن کے پنجے سے ضرور باہر آئے گا۔ میرا دل دائمی فراق کا خیال تک گوارا نہ کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک معلوم

غم مجھے کھائے جا رہا تھا۔

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کملیش اور اندرا ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑی چٹان پر بیٹھے ہیں۔ ہوا کے تیز جھونکے چیلوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں۔ اندرا کسی سوچ میں غرق پتھروں کے چھوٹے ریزے اُٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینک رہی ہے۔ دور نیچے ایک پہاڑی نالہ گونج رہا ہے۔ چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ریزوں کی آواز اُن کے کانوں میں گونجتی رہتی جب تک کہ وہ نالے کی روانی میں مل نہ جاتے۔ یکایک کملیش بولا۔

"اندرا آج کل تم غمگین کیوں رہتی ہو؟ اشوک کی یاد تو نہیں ستاتی؟"

"اگر ستائے بھی تو کیا کر سکتی ہوں؟" وہ آہ کھینچ کر بولی۔

"اگر چاہو تو اُس کے پاس واپس بھیجا دوں"

"اب وہاں جا کر کیا کروں گی۔ دیکھتے نہیں کہ میں بچے کی ماں بننے والی ہوں؟"

"بچے کی ماں؟" وہ حیرانی سے چیخ اُٹھا "کس کا بچہ؟"

"اپنے باپ کا اور کس کا؟"

"کس باپ کا؟"

"کیا باپ دس ہوتے ہیں؟ تمہارا اور کس کا؟" اور اُس کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

کملیش قہر آلود ہو اُٹھا۔ اُسے اس بات کا گمان بھی نہ تھا۔ وہ ہرگز یہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اسے شادی اور بچوں سے گھن آتی تھی جو زندگی کے طلسمی اور خوبصورت سپنوں کا تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ اُسے اپنے پرانے واقعات ایک ایک کر کے یاد

آگئے۔ اُس کا حال ازل کی اُس بھوکی چھپکلی کی طرح تھا جو سارا دن زبان نکالے شکار کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ اس کے لئے شادی ایک بندش تھی اور بچے ایک جال۔ وہ بندشوں کو توڑنا اور جال کو اُدھیڑ دینا چاہتا تھا۔ آج اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کا فلسفۂ زندگی کچلا جا رہا تھا۔ وہ جوش میں بھر کر اُٹھا اور بولا

"تیری یاد میں اشوک اب تک مرمٹا ہوگا۔ اس دنیا میں تو اُس سے نہیں مل سکتی۔ ہے، اس سے وہیں ملنا" اور بڑھ کر اُس نے اُسے کھڈ میں ڈھکیل دیا۔ لیکن وہ اپنا توازن بھی کھو بیٹھا تھا۔ اُس کا پاؤں پھسل چکا تھا بصد کوشش بھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ دو جسم چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے نالے کے شور میں جذب ہو گئے۔

میں چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔ کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے ہل رہے تھے۔ میرا کمرہ ہوا میں جھول رہا تھا۔ باہر لوگوں کی چیخ پکار بڑھتی جا رہی تھی۔

"بھونچال ___ زلزلہ ___ بھونچال ___!"

بُلبُلے

سامنے دیار کے اونچے درخت سبز چھاتے تانے کھڑے تھے۔ بائیں طرف عمیق غار تھے۔ سفید بادلوں کے دھوئیں غار کے دامن سے آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ نیلے پہاڑ کی چوٹی پر بھی سفید سفید دھواں اٹکا ہوا تھا۔ دور، اوپر آسمان کی بلندیوں میں، ہلکے کالے رنگ کے بادل اِٹھلا رہے تھے۔ بائیں طرف سورج خوابِ شب سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اُس کی سُنہری کرنیں بادلوں سے ہم آغوش ہو رہی تھیں اور درختوں کو چوم رہی تھیں۔ ایک گراموفون گا رہا تھا۔ ع

کالے کالے بادل گھر گھر چھا گئے، چھا گئے۔

پلنگ پر اُس کی بیوی کے پہلو میں بچّہ سو رہا تھا۔ بیوی کا رنگ بالکل زرد تھا، جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ پانچ سال پہلے ان گالوں میں گلاب کی سی تازگی اور آب و تاب تھی۔ کالج میں اسے "لالہ رُخ" کہا جاتا تھا۔ ہر نوجوان اُس کے حُسن کا مدّاح تھا۔ کالج کی تمام محفلوں میں اُسی کا ذکر اور طلبا کی خاص خاص مجلسوں میں اُسی کا چرچا رہتا تھا۔ کوئی اس کی ناک پر شعر زنی کرتا،

کوئی اُس کی آنکھوں کی مدح سرائی اور کوئی اس کی زلفوں پر قصیدہ سرائی کرتا۔ جماعت
۔۔ کمرے میں ڈیسکوں پر اُسی کی تصاویر کندہ ہوتیں۔ طلبا کی کاپیوں کے صفحات اُسکی
شکلوں سے پُر ہوتے لیکن اُس کے شباب سے بڑھ کر اسکے حسنِ بیان کی دھوم تھی۔ کالج میں اسکی
جادو بیانی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے طلبا اس کے آگے دم نہ مار سکتے تھے۔
وہ نوٹس کے بغیر بولتی اور اپنے موضوع کو اس خوبی سے نبھاتی اور اتنے دلائل سے
ثابت کرتی کہ سامعین دم بخود رہ جاتے۔ وہ حیران ہوتے کہ کیونکر ایک لڑکی، کمال
آسانی سے، ایک غیر ملکی زبان پر اتنی زبردست قدرت حاصل کر سکتی ہے۔ کالج کے
انگریز پروفیسر اپنی مادری زبان میں اتنی فصیح تقریر نہ کر سکتے تھے، بارہا اُن کی زبان میں
لکنت آجاتی تھی لیکن جب وہ بولتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آبشار نغمہ سرا ہے۔
بارہا اُس نے معرکہ آرا مباحثوں میں مخالفین کو شکست فاش دی تھی۔ جب مختلف
کالجوں میں کوئی بڑا مباحثہ ہوتا تو ہمانگنی کا اپنے کالج کی نمائندگی کرنا لازمی تھا۔
ایسے موقعوں پر وہ خوب جوہر دکھاتی۔ اپنی آتش بیانی سے بڑے بڑے
گھاگھوں کو تڑپا دیتی ۔ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا۔

لیکن وہ ہمانگنی کی کامیابیوں پر غصے سے تلملاتا رہتا تھا۔ بھلا کیا وہ فنِ تقریر
میں کسی سے کم تھا؟ ہمانگنی کے شہرت حاصل کرنے سے پہلے اُسی کا نام سب کی زبان پر
تھا، ہمانگنی کے نمودار ہونے سے جیسے اُس کی شہرت کو گھن لگ گیا، وہ اُسے ایک
آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اُس سے حسد کرتا تھا۔ بارہا ان دونوں کا مقابلہ ہوا۔ ہر بار
اسے منہ کی کھانی پڑی۔ وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ
صنف نازک میں سے نہ تھا۔

جب کالج یا ہوسٹل میں لڑکے ہمانگنی کو موضوعِ بحث بناتے اور آہیں کھینچتے ہوئے اُس کی تعریف کے راگ الاپتے تو وہ بھڑک اُٹھتا: "جنسی بھوک کے شکار! ایک لڑکی دیکھ لی۔ بس مرنے لگے۔ آخر اُس میں کیا سُرخاب کا پر ہے؟ آٹھوں پہر اُس کے راگ الاپتے ہیں۔ وہ تو ہر وقت غرور کے نشے میں سرشار رہتی ہے اور کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، مگر آپ لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ اُسے سر پر چڑھا رکھا ہے...."

"زہے قسمت اگر وہ ہمارے سر چڑھ سکے!" اصغر مرزا ایک لمبی آہ کھینچتا۔

"مگر میں نہیں سمجھتا آپ کس بنا پر اُس کی تقریر پر فدا ہیں؟"

"ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ——" اشرف لدھیانوی ترنم سے گاتے ہوئے بولتا۔

"آپ نے کبھی اُس کے مفہوم کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے؟" وہ گرم ہو جاتا۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں، کبھی نہیں۔ آپ صرف حُسن کے مُرید ہیں اور طرفداری کے شکار۔ آرٹ کو جاننے اور مفہوم کو سمجھنے کی آپ میں ذرہ بھر صلاحیت نہیں۔ یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے کہ محض صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے اُسے ممتاز سمجھا جائے۔"

"یہ کیا معمولی وجہ ہے؟" اصغر مرزا اور بھی لمبی آہ بھرتا۔

"یار کیا مجھوں کے دل نہیں ہوتا؟" درشن سنگھ بے قراری سے کہتا۔

"کاش وہ روز تقریر کرے اور انعام جیتے۔" وید پرکاش سگریٹ کا کش لگاتا ہوا بول پڑتا۔

"اور تم سینے پر ہاتھ رکھ کر آہیں بھرو۔" قہقہوں کی بوچھاڑ میں مُنیر لُقمہ دیتا۔

ٹیگور سوسائٹی کے زیرِ اہتمام منعقدہ تاریخی مناظرہ اُس کے خیالات کی سطح پر

تیرنے لگا ــــــــــــ

مختلف کالجوں کے طلبا کے علاوہ شہر کے معزّزین بھی شریک تھے۔ کس آن بان سے ہمانگنی اسٹیج پر آئی۔ ہال میں بجلی سی کوند گئی۔ بے شمار پُرجوش تالیوں نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ پھر ہال میں ایک سنّاٹا چھا گیا، جیسے لوگوں کو کسی جادوگر نے مسحور کر لیا ہو۔ تمام نگاہیں ایک ہی شکل پر مرکوز تھیں۔ نوجوان اپنے سینے تھامے بیٹھے تھے جیسے اندیشہ ہو کہ دل سینہ چیر کر اُڑ جائیں گے۔ ہمانگنی نے تقریر شروع کی۔ وسیع ہال اُس کی سُریلی آواز سے گونج اٹھا۔ لوگ دم بخود بیٹھے تھے، جیسے اُن پر منتر پھونک دیا گیا ہو۔ اس کے بے مثال حُسن، اُس کی بے نظیر طرزِ ادا اور اُس کی مترنّم آواز نے لوگوں کو مبہوت کر دیا۔ اُس کی ایک ایک دلیل سینکڑوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اس شدّت سے آپس میں ٹکراتی تھی کہ ہر لمحہ چھت کے اُڑ جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔

ہمانگنی کے بعد اُس کی باری آئی۔ مگر اس جادوگرنی کے بعد تقریر کرنا، بنسری کے بعد ڈھول بجانا تھا۔ حُسن کے اَن گنت پیمانوں سے چڑھے ہوئے خمار کو اُتارنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ اس وقت لیونارڈو ڈی ونچی کی فصاحت مستعار لے آتا تو بھی فتح کی امید پانی کو بلونا تھا۔ تاہم اُس نے ہمّت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ دل مضبوط کر کے باآوازِ بلند تقریر شروع کی لیکن کوئی اُس کی طرف متوجہ ہی نہ تھا۔ سامعین اُباسیاں لے رہے تھے جیسے کئی دن سے سوئے نہیں تھے۔ پھر بھی وہ پورے جوش اور جذبے سے بولتا رہا۔ لیکن اچانک ہال پُرزور قہقہوں سے گونجنے لگا۔ حاضرین صاحب صدر کی طرف دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ اُس نے دیکھا موصوف میز پر سر رکھے گہری نیند میں مست، زور زور سے خرّاٹے لے رہے تھے۔ خرّاٹوں کی آواز

لوگوں کو پاگل بنا رہی تھی۔ ہال میں ایک طوفان برپا تھا۔ ایک دم، خواب شیریں کا طلسم ٹوٹنے پر ایک جھٹکے کے ساتھ سر اُٹھا کر ممدوح پوری قوت سے ہاتھ پٹیتے ہوئے بولے "ہیر، ہیر، ہیر" حاضرین کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے جھومنے اور ناچنے لگے۔ قہقہوں کا شور چھت کو پھاڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ بصد مشکل لوگ اپنے کو قابو میں رکھ سکے۔

اختتام پر جیسا کہ پہلے سے نظر آ رہا تھا قرعہ ہمانگنی دیوی کے نام نکلا۔

اس کے دوسرے دن ــــــــ

پرنسپل صاحب نے ان دونوں کو اپنے یہاں چائے پر بلایا۔ وہ اس کے لئے تیار نہ تھا۔ اُسے ہمانگنی سے چڑ تھی۔ لیکن پرنسپل کی بات ٹالنا بھی مناسب نہ تھا۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پرنسپل بولے "کل کے مباحثے میں آپ دونوں نے کمال کر دیا۔ کالج کے نام کو چار چاند لگا دئے۔ آپ دونوں کا ممنون ہوں اور آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی........"

"صاحب، آپ کا ٹیلیفون ہے" نوکر نے آ کر مداخلت کی۔

"معاف کیجئے! میں دو منٹ میں لوٹ کر آتا ہوں" ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر وہ چلے گئے۔

اگر نوکر وہاں سے نہ جاتا تو اُسے کتنا حوصلہ رہتا۔ لیکن ہمانگنی کے روبرو تنہائی میں بیٹھ کر وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ گھبرائی ہوئی حالت میں، چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے، اُس کی نگاہیں ہمانگنی کی طرف اُٹھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہیں اُس کی نگاہیں پھر ہمانگنی کی آنکھوں سے نہ ٹکرا جائیں۔ اس پر ایک عجیب حالت

طاری تھی۔ اچانک اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ گیا۔ اگر اُسے اُس وقت میز کے نیچے چھپنے کی اجازت مل جاتی تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ لیکن اُسی وقت جیسے اُس کی خفت مٹانے کے لئے ہمانگنی بولی "کل تو آپ نے خوب جوہر دکھائے"

وہ ان الفاظ کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ وہ تو ان کے برعکس الفاظ سُننے کی توقع رکھتا تھا۔ وہ اس سے اُلجھنا، جھگڑنا اور لڑنا چاہتا تھا۔ سمجھوتے کی اس پیشکش نے اُسے تذبذب میں ڈال دیا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ حریف نئے حربے استعمال کر رہا ہو۔

"آدمی جوہر دکھائے بھی تو کون پوچھتا ہے؟" اُس نے تلخی سے کہا۔

غصّہ ظاہر کرنے کے بجائے ہمانگنی ہنس پڑی اور اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو اُس کے چہرے پر جماتے ہوئے بولی ——— "اگر میں جج ہوتی تو آپ کے حق میں فیصلہ کرتی"

"کس بنا پر ——— ؟"

"آپ کی فصاحت کے کیا کہنے۔ میں نے تو کل پہلی بار آپ کی قابلیت کے جوہر دیکھے"

"خبر نہیں عورتیں دوسروں کو بنانے میں اتنی لذت کیوں محسوس کرتی ہیں؟" وہ چڑ کر بولا۔

"خبر نہیں مرد ہر بات کو شک کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں؟" ہمانگنی نے نرمی سے کہا "میرے خیال میں سچی مردانگی تو انسان کو شک اور جھوٹ سے متنفر رہنے کی تلقین کرتی ہے"

"شک کرنا بزدلی اور شکی ہونے کی علامت نہیں ہے"

"یہ احساسِ کمتری کی نشانی ہے جو بزدلی کا دوسرا نام ہے"

"معاف کیجیے گا" پرنسپل صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "وائس چانسلر صاحب سے فون پر باتیں کر رہا تھا ہاں ———" اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اُنھوں نے کہا "آئندہ ماہ لکھنؤ آل انڈیا ڈبیٹ کے لئے میں نے آپ دونوں کا نام پروپوز کیا ہے۔"

وہ دونوں ساتھ لکھنؤ گئے اور ساتھ ہی واپس آئے۔ اب وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے وہ دونوں سالہا سال سے اکٹھے رہتے آئے تھے۔ وہ ایک دوسرے میں جیسے گھُل مِل گئے تھے۔ اُن کے کپ جیتنے کی خوشی میں پرنسپل صاحب نے سٹاف اور کالج کے چیدہ لڑکوں کو مدعو کیا اور دونوں کی تعریف کے پُل باندھ دیے۔ اب وہ ہمانگنی پر نکتہ چینی نہ کرتا۔ پہلے وہ اُس کی تعریف سُن کر آگ بگولا ہو جاتا تھا۔ اب اُس کی ہجو سُن کر تلملا اُٹھتا۔ کالج کے طلباء کو یہ تبدیلی پسند نہ تھی۔ وہ سب ہمانگنی پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ اب جیسے اُن کا حق چھن گیا ہو۔ وہ اُس کی موجودگی میں تو خاموش رہتے، لیکن پس پشت دونوں کا مضحکہ اُڑاتے۔ تختہ سیاہ پر ان دونوں کی مختلف وضع کی تصاویر ہوتیں، کبھی کبھی نہایت فحش قسم کی۔ اُس کا دل جل کر کباب ہو جاتا۔ غصے کی لہریں اُبھرتیں لیکن دب جاتیں۔ اُسے اپنی عاجزی پر ترس آجاتا۔ اُس کے عزیز دوست بھی اُس سے بگڑ گئے۔ کئی پُرانی دوستیاں یک لخت ختم ہو گئیں۔ ہمانگنی کے لیے اُسے کتنی عظیم قربانیاں دینی پڑیں، لیکن اُس نے سب برداشت کیا۔ وہ اب اُس پر پورا تسلط جما چکی تھی۔ اُس کے دل و دماغ پر ہمانگنی ہی کا قبضہ تھا۔ ایک ہی خیال اُسے ستاتا، ایک ہی خواب اُسے نظر آتا۔ نہ جانے کیوں اُسکے ہر خیال کے بعد ہمانگنی ضرور موجود ہوتی۔ خواہ وہ امتحان یا دوستوں کے بارے میں سوچتا، خواہ والدین یا رشتہ داروں کے بارے میں، ہمانگنی وہاں ضرور ہوتی۔ ایک عجیب سی

بے چینی کا جذبہ اُس پر غالب رہتا۔ کیا ہمانگنی اُس کی نہیں ہو سکتی؟

اور پھر ایک دن ———

اُس نے یہی سوال ہمانگنی سے کر دیا۔ ایک مختصر سے خط میں۔ ہمانگنی نے فوراً جواب دیا۔ خط کھولتے وقت اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ٹانگیں ڈگمگا رہی تھیں، کہیں اُس نے درخواست ٹھکرا نہ دی ہو ——— اُس نے درخواست ٹھکرائی نہیں تھی، اُسے قبول کر لیا تھا۔

کیلاش کی تیز چیخ نے اُسکے خیالات کے سلسلے کو منتشر کر دیا۔ بچہ جاگ کر بلند آواز میں رو رہا تھا۔

"کیا اِس گھر میں سب مر گئے ہیں؟" نیند سے چونک کر لال لال آنکھیں دکھاتی ہوئی ہمانگنی بولی۔

"پوری طرح نہیں مرے، ابھی سسک رہے ہیں۔" اس نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے، اُسی طرح باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو باتیں بنانی آتی ہیں۔ کیا آپ میں اتنی بھی انسانیت نہیں کہ روتے ہوئے بچے کو چپ کرا سکیں؟"

"کبھی تھی، اب نہیں۔ صحبت کا اثر ہے نا۔" اُس نے نرمی سے چٹکی لی۔

"بس آپ کو ترکی بہ ترکی جواب دینا آتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"کہہ تو دیا کہ صحبتِ بد کا اثر زائل نہیں ہوتا۔" اُس نے سامنے دیار کے درخت پر دو بندروں کو لڑتے ہوئے دیکھکر کہا۔

"کس کی صحبتِ بد؟ میری یا تمھاری؟" چارپائی پر بیٹھتے ہوئے آگ کی طرح

مشتعل ہو کر ہمانگنی بولی۔

"بکواس بند کرو۔" وہ گردن گھما کر چلّایا۔ اُس کی آنکھوں میں جیسے چنگاریاں ناچ رہی تھیں ـــــــ "تم نے زندگی اجیرن کردی ہے۔ تمھاری قابلیّت اور محبّت کے دعوے سب دکھاوے کے تھے۔ پانی کی سطح پر اُٹھنے والے بُلبُلے ـــــــ" اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا ـــــــ "تم کو دولت کی تلاش تھی۔ تم نے صرف اس لئے مجھ سے شادی کی کہ شاید میں آئی۔ سی۔ ایس ہو جاؤنگا اور تم عیش کروگی۔ میں نے تمھارے لئے کیسی کیسی قربانیاں دیں۔ تمھاری محبّت کی خاطر والدین کے حکم کو ٹھکرایا۔ اُن سے بگاڑ لی ـــــــ مگر ـــــــ" غصّے کی شدّت سے اُس کی زبان رُک گئی۔ وہ غصّے کے مارے کانپ رہا تھا۔

ہمانگنی کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ وہ تکئے میں منھ چھپائے سِسکیاں بھر رہی تھی۔

دفعتہً باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ دونوں چونک کر جیسے سنبھل گئے۔ باہر سے آواز آرہی تھی "بھئی ہم آئے ہیں تواری جی!"

اوہو ـــــــ مہتہ اور مسز مہتہ آئے ہونگے۔ آج اتوار ہے نا۔ اُن دونوں نے جلدی جلدی اپنے غصّے اور آنسوؤں کو روکا۔ وہ دوڑ کر ہنستا ہوا دروازے پر پہنچا۔ ہمانگنی نے جلدی سے بال سنوار کر منھ دھویا۔ اُس کے کانوں میں یہ الفاظ جیسے گونج رہے تھے ـــ "تمھاری قابلیّت اور محبّت کے دعوے سب دکھاوے کے تھے، پانی کی سطح پر اٹھنے والے بُلبُلے۔" اُس نے سوچا ـــــــ اور اب مسٹر اور مسز مہتہ کے سامنے ہم دونوں ہنسی خوشی سے رہنے والے میاں بیوی کا جو پارٹ ادا کریں گے، یہ کیا ہوگا، یہ بھی دکھاوا ہے۔ اس وقت کی سب باتیں کیا ہونگی؟ وہی بُلبُلے ـــ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

زندگی خود ایک بُلبُلہ ہے طوفان میں ناچتا ہوا بُلبُلہ !

جب وہ ہنستی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہوئی تو مسٹر اور مسز مہتہ کے ساتھ وہ بھی قہقہے لگا رہا تھا اور اُس نے سوچا، یہ قہقہے بھی تو بلبلوں ہی کی طرح ناپائدار ہیں۔

تلاطم

بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل ساکن تھی۔ لیکن یہ سکوت طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ آندھی کے سیاہ لشکر مغرب سے اُٹھے اور قصبے پر چھا گئے۔ قیامت برپا ہو اُٹھی۔ مشرق سے بادلوں کے کالے دل لئے سرد ہوائیں بڑھیں۔ شدّتِ باراں سے طوفان کی فوجیں پسپا ہو گئیں۔

ڈولی میں بیٹھی دلہن نے آنسوؤں کی جھڑی لگا رکھی تھی۔ ان آنسوؤں میں ماضی کے گزشتہ سانحات تیر رہے تھے۔ اور مستقبل کے یقینی خواب انگڑائیاں لے رہے تھے۔

"مت رو بیٹی!" باپ نے بھیگی آنکھوں کو پگڑی کے دامن سے پونچھتے ہوئے کہا
اُونہہ۔۔۔۔ اُونہہ۔۔۔۔ ا۔۔۔۔ و۔۔۔۔ نہہ۔۔۔۔۔۔۔

ڈولی چل پڑی۔

کچھ فاصلے پر وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

گرمی کے آثار مٹ چکے تھے۔ آندھی کے نقوش مفقود ہو چکے تھے۔ بارش

ختم چکی تھی۔ اس کے نزدیک گرمی، آندھی، بارش، قدرت کے مختلف پہلو تھے۔ دکھ ہیجان اور تسکینِ زندگی کے متعدد شعبے، رنگ افشانیاں قدرت کا اہم خاصّہ، اور ردوبدل زندگی کے ناگریز پہلو تھے۔ گرمی اور سردی کے چکّر قدرت کے نظام میں داخل تھے۔ اور سکھ دکھ کے دائرے زندگی کے لازم اجزا تھے۔

ڈولی چلتی رہی۔ بلا کوشش اور بلا تردّد اس کے قدم اس کے عقب میں اٹھتے گئے۔ جھیل کے کنارے پہونچکر ۱۳ اکے قدم رک گئے، لیکن نگاہیں چلتی رہیں۔ وہ ڈولی کا تعاقب کرتی رہیں۔ جب تک کہ آموں کے جھرمٹ نگاہوں اور ڈولی کے درمیان سدِراہ نہ بن گئے۔

جھیل میں لہریں پابندیٔ قید سے بیزار تھیں۔ حریّت کی جستجو نے انھیں پاگل بنا رکھا تھا۔ ہوائے آزادی میں سانس لینے کی پرزور تمنا انہیں حبس بیجا سے بھاگ جانے پر اُکسا رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس آزادی اور موت کے درمیان صرف ایک مہین پردہ حائل ہے۔ پابندیٔ حبس زندگی کی شرط تھی، اور نجات موت کی دعوت۔ وہ نتیجہ سے بے پرواہ کنارے کی طرف بڑھیں جیسے ایک غیر منظم فوج اپنی طاقت کا جائزہ لئے بغیر دشمن کی قلعہ بندی کو توڑنے کے ارادے سے آگے بڑھے۔ وفورجوش سے وہ کنارے سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ وہ ان کی سعی لاحاصل پر ہنس دیا۔ لیکن وہ ازلی شکست شاید ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ وہ پھر ایک نئے جوش کے ساتھ حملہ آور ہوئیں۔ لیکن دشمن کی مضبوط فصیلوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

جھیل میں طوفانی ہل چل مچ گئی۔ شکست خوردہ لہروں نے طوفان بدتمیزی

پیدا کر دیا۔ پر شور چیخیں ماحول پر چھا گئیں۔ سرخ لباس زیب تن کئے، ہاتھوں میں احمریں چوڑیاں پہنے، اور پاؤں میں پائیل باندھے ایک حسینہ جھیل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کی سطح پر اُبھری، سیاہ زلفیں شانوں پر بکھیرے اور آنکھوں میں شعلہ جوالہ لئے وہ بدمست لہروں کی کانپتی چھاتیوں پر والہانہ رقص میں محو ہو گئی۔ گیت کی گونج پائیل کی چھنکار، اور لہروں کا نغمہ فضاؤں میں پھیل گیا۔ لہروں پر سوار، رقص میں مست، وہ مجنونانہ ادا سے کنارے کی طرف بڑھی۔

"کون؟ نینا؟ نئی دلہن؟" اس نے منہ موڑ لیا۔

"ارے کیا تم خفا ہو؟........بولتے کیوں نہیں.........دیکھو میں تمہارے لئے کھلونا لائی ہوں"

"کھلونا؟" اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کھلونا۔ ربر کی گیند۔ کل چچا شہر سے لائے تھے۔ ہریش جھگڑنے لگا کہ گیند وہ لے گا۔ ماں چچا کے سر ہو گئی کہ وہ ہمیشہ ایک چیز کیوں لاتا ہے۔ پتا جی ادھر آنکلے۔ ہریش اب بچہ نہیں، وہ بولے۔ چچا کی جیت ہوئی میری جیت ہوئی اور........"

"اور کس کی جیت ہوئی؟"

"تمہاری"

"وہ کیسے"

"میری جیت، تمہاری جیت" اور اس نے جھٹ اپنے ننھے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔

"گیند کا کھیل ان کی دلچسپی کا خاص موجب ہوتا تھا۔ ایک دن نینا نے گیند کو

زور سے اُچھالا۔ وہ پانی میں جاگری۔ وہ اس کے پیچھے کودا۔ لہریں گیند کو دھکیل کر لے گئیں۔ وہ بڑھتا گیا۔ وہ چلائی ہاتھ بڑھاؤ، اس نے ہاتھ بڑھایا، تب اچانک وہ نیچے کو دھنسا۔ اور جھیل کے پانی میں غائب ہو گیا۔ اس کی چیخیں سن ایک گڈریا وہاں آپہونچا۔

"وہ اُبھرا" وہ چلائی۔ گڈریئے نے چھلانگ لگادی اور اسے جا دبوچا۔

"ارے تم ہو رمی؟ یہاں کیا کرتے ہو؟ اگر ڈوب جاتے پھر؟"

"اگر میں ڈوب جاتا؟"

"ایسا نہ کہو" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"کیوں؟"

"تو میرا دنیا میں کون تھا؟" اتنا کہہ کر وہ بھاگ گئی۔

اور وہ سکول سے اکثر بھاگ آتا۔ طرح طرح کے بہانوں سے وہ وہاں سے کھسک جاتا اور سیدھا جھیل کا راستہ پکڑتا۔ وہاں پہنچ کر آواز دیتا۔ "او نینا" آم کی اوٹ سے جوابی آواز آتی۔ وہ آواز کے پیچھے دوڑتا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر پیپل کے پیچھے جا چھپتی۔ وہ اس کا تعاقب کرتا۔ اب وہ آم کے درخت پر چڑھ جاتی۔ اور وہ بھی اس کا پیچھا کرتا۔ اور اس کے قریب اسی ٹہنی پر بیٹھ جاتا۔

"جب ہم کسی کو بلاتے نہیں تو ہم سے کوئی کیوں بولتا ہے؟" وہ منہ بنا کر کہتی۔

"ہم کسی کے گھر تھوڑی بیٹھے ہیں۔ خدا کے آم پر بیٹھے ہیں" وہ منہ پھیر کر کہتا۔

"خدا کا آم — خدا کا آم" وہ چڑاتی اور تالی بجاتی۔ دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

"شنو نینا" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر دباتے ہوئے اس نے ایک دن کہا۔

"میں تمہیں آج ایک ضروری بات سنانا چاہتا ہوں۔"

"اور سنو رمی میں آج تم سے کوئی ضروری بات سُننا نہیں چاہتی۔" وہ شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولی:

"میں مزاق نہیں کر رہا۔"

"تم اس کے اہل ہی نہیں۔"

"میں شہر جا رہا ہوں۔"

"تو اس میں سنجیدگی کی کیا گنجائش ہے؟"

"کل صبح جاؤں گا۔"

"میرے لئے کیا لاؤ گے؟"

"کیا لاؤں؟"

"کب لوٹو گے لیکن؟"

"چھٹیوں میں۔"

"کیا مطلب؟"

"اب میں وہاں پڑھا کروں گا۔"

شاخ کو جنبش ہوئی۔ تنا ہوا میں لہلہایا۔ بصد مشکل وہ اپنے آپ کو سنبھال سکا لیکن وہ زمین پر گر پڑی تھی وہ بھی کو دپڑا وہ بیہوش پڑی تھی۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن کو جھیل کے پانی میں ڈبویا اور اس کے منہ میں نچوڑ دیا۔ پھر اوک میں پانی لایا اور اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔

"رمی"

اس نے نینتا کے کلیوں سے سفید اور پھول سے ملائم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" اس نے آہستہ سے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم"

"تم گر کیوں پڑی تھیں؟"

"کیا جانوں"

"بے ہوش ہونے کی کیا وجہ تھی؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟" وہ بیقراری سے بولی۔

"ارے تم تو روتی ہو۔ یہ کیا! بھلا پاگل ہو گیا؟"

"ہاں پاگل ہوں"

"پاگل مت بنو، نینتا"

"تو تم شہر جانے کا ارادہ ترک کر دو"

"اچھا نہ جاؤں گا"

وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ اس کے بازو اس کی گردن میں حمائل تھے۔

لیکن شہر جانا پڑا۔ وعدہ خلافی کرنی پڑی۔ اب وہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن نئے ماحول سے وہ مانوس نہ ہو سکا۔ ہر دوسرے ہفتے گھر لوٹ آتا۔ اور سب سے پہلے نینتا ہی سے ملتا۔

"آج ماں کہنے لگی" نینتا نے ایک دن اس سے کہا "نینتا اب اس کے ساتھ باتیں نہ کیا کرو"

"تو تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا۔ "تو کس کے ساتھ کردں"۔ ماں نے کہا۔ "سہیلیوں کے ساتھ" "کیوں کیوں اب اسے کیا ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اب وہ بڑا ہو گیا ہے"۔ ماں بولی۔ "اور میں کیا چھوٹی ہو گئی ہوں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "چپ رہو۔ سارا دن جرح ست کیا کرو"۔ نہ جانے کہاں سے آکر چچا مجھ پر برس پڑے"۔ پھر وہ بولی۔

"رمی اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ اور بڑوں کو آپس میں نہ ملنا چاہیے"

"ہاں گاؤں میں بالکل نہیں ملنا چاہیئے"۔ وہ مصنوعی سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔

"صرف جھیل کے کنارے ملنا چاہیئے"۔ اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اس ہنسی نے ماں کی تنبیہ اور چچا کی جھڑکیوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ وہ اُسے گانا سکھاتا۔ وہ گاتی، "بن کی چڑیا بن کے بن بن ڈولوں گی"۔ اور بھاگ نکلتی۔ وہ بن کی چڑیا کا تعاقب کرتا۔ آم کے پیچھے۔ پھر پیپل کے پیچھے۔ وہ اچانک پیچھے مڑ کر اُسے پکڑ لیتا اور آغوش میں بھینچ لیتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ حسب دستور ملتے رہے۔

ایک دن وہ بولا

"نینا میں واپس شہر جا رہا ہوں"

"کب؟"

"پرسوں!"

"پھر کب لوٹو گے؟"

"بڑے دنوں میں"

"لیکن ابھی تو پندرہ دن باقی ہیں۔"

"مجھے سوشیل کا خط ملا کہ جلد آؤ۔"

"کیا کوئی لڑکی ہے؟"

"ہاں...... کیا...... کون؟"

جیسے اس کے منھ پر کسی نے چپت لگائی ہو، وہ دیوانہ وار گھر کی طرف بھاگا۔ وہ حیران تھا کہ اسے یوں یک لخت کیا ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ اسے پکڑ نہ سکا۔

تیسرے دن وہ چلا گیا۔

اس کے بعد کئی سال ان کی ملاقات نہ ہوئی۔ قصبہ میں ملنے کا موقع نہ ملتا۔ یا اتفاقاً وہ کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوتی۔ اسکول چھوڑ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ بی اے پاس کر لیا۔ ملازمت مل گئی۔ لیکن اس سے ملاقات کا اتفاق نہ ہوا۔

اس بار جب وہ گاؤں آیا تو اس کی بارات آئی ہوئی تھی ——— !

فضا میں رقص کی آواز پھر بلند ہوئی۔ پائل پھر بجنے لگے۔ موسیقی کی لہریں فضا میں گونج اٹھیں۔

"بند کرو ناچ۔ وہ چلّایا۔"

لیکن ناچ جاری رہا۔

"میں کہتا ہوں ختم کرو اس ڈھونگ کو۔ میں نہیں دیکھنا چاہتا یہ ناچ۔"

اس کی آواز ہوا میں گرج اٹھی، رقص بند ہو گیا۔ لہریں خاموش ہو گئیں اور جھیل کا نیلگوں پانی ساکن ہو گیا۔

دلہن آگے بڑھی اور قریب آکر طنزاً بولی:۔

"غصہ کیوں؟ ناچ سے اتنی نفرت کیوں؟ یہ خوشی کا نہیں مجبوری کا رقص ہے۔ میرے جسم کا رُواں رُواں جل رہا ہے۔ انتقام کی مہیب آگ میرے اندر بھڑک رہی ہے۔ تم نے مجھے جلایا۔ میں تمہیں ستاؤں گی۔ تم نے میری خوشی کو خاک میں ملایا۔ میں تمہارے سکون کو برباد کردوں گی۔"

"لیکن یہ سب کچھ کیوں؟"

"کیوں؟ اپنے آپ سے پوچھو، جس نے میری پاکیزہ محبت کو ٹھکرایا۔"

"کب اور کیسے؟"

"وہ سوشیل کون تھی؟"

"کون سوشیل؟"

"جس کے خط نے میری ہنستی ہوئی زندگی کا رُخ پلٹ دیا۔"

وہ دیوانہ وار ہنسا۔

"وہ تو میرا دوست سوشیل کمار تھا۔"

"سوشیل کمار؟"

فضا میں شور بلند ہوا۔ مغرب سے ایک طوفان اُٹھا۔ بھیانک چیخوں سے آسمان گونج اُٹھا۔ جھیل کے پانی میں طوفان اُمنڈ پڑا۔ دندناتی ہوئی تیز ہوا کے جھونکوں نے آم اور پیپل کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔ قدرت قہر آلود ہو اُٹھی۔ ناچ اور بھی تیز ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل بجلیاں بن کر کوندنے لگیں۔ اس کی اندوہناک چیخیں فضا میں پھیل گئیں۔ وحشیانہ ناچ میں مست، لہروں کی اچھلتی ہوئی

چھاتیوں کو روندتی ہوئی، وہ اچانک پانی کی گہرائیوں میں سما گئی ایک دم قدرت
ساکن ہوگئی۔ فضا میں قبرستان کا سکوت چھا گیا۔

ٹر۔۔۔ٹر۔۔۔۔ر۔۔۔۔ر۔۔۔۔۔۔" ایک مینڈک ٹرا رہا تھا

"بدذات کہیں کا"۔ اس نے پتھر کا نشانہ باندھتے ہوئے کہا "کیا شور
مچا رکھا ہے؟۔۔۔۔"

"میں شور نہیں مچا رہا۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے چھٹی کی
اشد ضرورت ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

"میرے ایک عزیز دوست کی شادی ہے۔"

"عزیز دوست کی شادی ہے!" اس نے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا "آپ
کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ موجود رہتا ہے۔ کبھی شادی، کبھی موت، کبھی کھانسی
کبھی زکام، لیکن دفتر کا کام کیسے چلے گا؟ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمیشہ آپ کی شکایت
کرتے ہیں ۔۔۔ آپ کے ڈرافٹ دوبارہ لکھنے پڑتے ہیں۔ آپ کا کام پینڈنگ
رہتا ہے۔ دفتر میں آپ ہمیشہ دیر سے آتے ہیں۔ آپ کو پچاس بار تنبیہ کی جا چکی
ہے۔ لیکن آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر آپ سے کام نہیں چلتا تو استعفے
دیدیجئے۔"

جب وہ گھر آیا غم و غصے کی آگ اس کے اندر سلگ رہی تھی۔ وہ اسسٹنٹ
سکریٹری کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ بدذات
حرامی، کمینے۔ وہ آپے سے باہر تھا ــــــ!

دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید کلدیپ تھا۔ کیا عجب شخص ہے یہ بھی۔ شاید اسے اپنے گھر میں کوئی کام ہی نہیں۔ یا اُسے وہاں کوئی گھسنے نہیں دیتا۔ یہ لوگ بھی عجب دردِ سر بن جاتے ہیں اور جب اس کا بات کرنے کا موڈ ہی نہیں تو یہ لوگ کیوں خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں۔ آج وہ اسے کھری کھری سنا دے گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے اُس نے؟

لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو اُس کا دوست ترپندر کھڑا تھا۔

"بھئی کیا خوب! دفتر سے سیدھے گھر کیوں بھاگ آئے بھلا؟ کیا کچھ ہے آج؟" اس نے دونوں ہاتھ گھماتے ہوئے کہا۔

"طبیعت خراب ہو گئی تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"یار کیا خوب ہو تم بھی۔ ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتے ہو۔ اِدھر دیکھو کوئی کچھ بکتا رہے، ذرا پروا نہیں۔ اور پھر ولیم کی باتوں کا غصہ ہی کیا۔ کان کا کچّا ہے ذرا۔ جھٹ سپرنٹنڈنٹ کی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور بیچارہ رام لال! مجھے تو اُس پر غصہ آنے کے بجائے ترس آتا ہے۔ غریب عادت سے مجبور ہے۔ تیس روپے پر بصد خوشامد بھرتی ہوا۔ بیس سال جوتیاں چٹخانے کے بعد کہیں جا کر سپرنٹنڈنٹ بنا۔ ساری عمر جوتیاں کھاتے گزری اب انھیں ہم پر اُگل رہا ہے۔"

"لیکن اسسٹنٹ سکریٹری کے کان کیوں بھرتا ہے؟"

"پیٹ کا ہلکا ٹھہرا۔"

"یہ کم ظرفی کی علامت ہے۔"

"لیکن دل کا صاف ہے۔"

"اور زبان کا نہیں۔ میں اسے زبان کی صفائی سکھا دوں گا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اس کی کھوپری پلپلی کر دوں گا۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہی۔ ہی ہی۔ بھئی واہ۔" نریندر نے کمرہ سر پہ اٹھا لیا۔ "تم پہلے اپنی کھوپری تو بچا لو۔"

"کیسے؟"

"اس سے۔" اس نے جیب سے ایک بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟"

"سکاچ۔"

"لیکن میں تو نہیں پیتا۔"

"تبھی تو کھوپری خراب ہے۔"

"میں نہ پیوں گا۔"

"یار کیا فضول آدمی ہو۔ نہ جانے کب تمہیں عقل آئے گی۔ بھلا ایک دو پیگ لگانے میں کیا حرج ہے۔"

"بھئی مضر صحت ہوتی ہے۔"

"یار کیا جھک مارتے ہو۔ جو لوگ اسے پیتے ہیں سب بیمار رہیں؟ کیا سب پرہیزگار تندرست ہیں کیا پانی کی جگہ شراب پینے والے ملکوں میں تپ دق کا دور دورہ ہے؟ بیٹا ایک پیگ لگاؤ اور دنیا کے رنج والم کو بھول جاؤ۔ دنیا میں سوائے جیتر کے رکھا ہی کیا ہے؟"

اور اس نے شیشے کے دو گلاس اٹھا کر ان میں وسکی انڈیل دی۔

جب وہ پی چکا تو اس پر ایک عجیب سرور غالب آ رہا تھا۔ کمرے کی اشیاء چھت اور دیواریں گھوم رہی تھیں۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" وہ بہکنے کے انداز میں بولا۔

"کہیں گھومنے جاؤں گا، اور دل بہلانے" نریندر نے کش لگاتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

"کیا ساتھ دو گے؟"

"شاید"

اور وہ دیدار کے گھر پہونچے۔ شہر کے اندر گندی گلیوں میں سے گذرتے ہوئے وہ ایک مکان پر پہونچے۔ میلی سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر دو عورتیں بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس، سُرخی اور پاؤڈر سے منھ بگاڑے، زانوؤں کے بل بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس قدِ آدم حقہ رکھا تھا۔ فرش پر بڑی بڑی مونچھوں والے تین غنڈے بیٹھے تھے۔ طبلہ، سارنگی اور ہارمونیم ان کے سامنے رکھے تھے۔

"بڑی مدت کے بعد آنا ہوا" موٹی عورت نریندر کو مخاطب کر کے بولی۔

"اُستاد فتو اب تم جاؤ"

اور تینوں غنڈے بلا لب ہلائے چلے گئے۔

نریندر نے دیدار سے اپنے دوست کا تعارف کرایا۔

وہ بہت خوش تھی۔ ایک نیا خریدار مل گیا تھا۔ وہ بھی ناخوش نہ تھا کیونکہ اُسے غم غلط کرنے کے لئے اچھا اڈا مل گیا تھا۔ نہ جانے وقت کس طرح

گذر جاتا۔ خورشید خوش گلو تھی۔ اس کے سریلے گانے میں وہ دفتر کی خشک زندگی کو بھلا سکتا تھا۔ کبھی کبھی دیدار گانے کے لئے بضد ہوتی۔ سر، تال سے بے خبر وہ چیخنا شروع کر دیتی۔ اس کی دلخراش آواز کانوں کے پردے پھاڑتی۔ کمرے میں شور اٹھ جاتا۔ اسکا دل چاہتا کہ بھاگ جائے لیکن ....

"میں لیکن ویکن کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے؟ چھ مہینے گذر گئے ہیں اور آپ نے کرایہ کا ایک پیسہ نہیں چکایا۔ میں اب زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔"

"آپ کے کتنے روپے ہیں؟"

"دو سو روپے"

"کیا آپ ایک ماہ اور انتظار نہیں کر سکتے؟"

"ایک دن نہیں"

"لیکن دیکھئے اتنی جلدی تو انتظام نہیں ہو سکتا"

"کہیں سے لا کر دو میں نہیں جانتا۔ اور آئندہ کے لئے اگر آپ باقاعدہ کرایہ نہیں دے سکتے، تو مکان خالی کر دیجئے"

"اور خود کہاں جاؤں؟"

"دیدار کے پاس"

گویا کسی نے اس کے زور سے تھپڑ رسید کیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ دیوانہ وار اس پر پل پڑا اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ اس کے دانت باہر آگرے۔ اس کے گالوں پر خون جھلکنے لگا۔

"مار ڈالا.... مار ڈالا.... مجھے بچاؤ...." اس نے شور مچایا

شروع کر دیا.......

شور سارے شہر پر چھا چکا تھا۔ چالیس لاکھ باشندوں کی آبادی پر عجیب حالت تھی۔ جوش اور خوف، غصہ اور ڈر۔ شک اور تذبذب۔ نفرت کا دریا موجزن تھا۔ انسان جنگلی درندہ بن بیٹھا تھا۔ خونخوار بھیڑیا اور گرسنہ دیو۔ "آدم بو" "آدم بو" کی پکار سے آسمان چیخ رہا تھا۔

لاٹھیوں، اینٹوں، چاقوؤں، چھروں اور لوہے کی سلاخوں سے مسلح، ایک بھاری ہجوم ایک بڑے مکان کو گھیرے کھڑا تھا۔ انکے پاس پٹرول کے کنستر بھاری تعداد میں موجود تھے۔ چشم زدن میں دھوئیں کے بادل آسمان میں نمودار ہوئے۔ آگ کے شعلے لپکے۔ انسانی کاریگری سے تعمیر کئے ہوئے سر بفلک محلوں کو ان شعلوں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ان میں تھے بیشمار بچے، عورتیں اور مرد۔ ان کی دردناک چیخوں نے آسمان ہلا ڈالا اور موسلادھار بارش ہونے لگی۔ آگ کے شعلوں کو سرنگوں ہونا پڑا۔ لیکن ایک بے پناہ سمندر کی طرح ہجوم آگے بڑھا۔ بارش کے بچائے ہوئے انسانوں کو مزہ چکھانے کے لئے۔ جو اوپری منزلوں میں بیٹھے آخری گھڑیاں گن رہے تھے، زندگی اور موت کے درمیان اس ہولناک وقفے میں سسکیاں لیتے ہوئے۔

"پکڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے" ایک طرف سے آواز آئی۔

ہجوم آواز کی طرف بہہ نکلا۔ چار آدمی، زخم خوردہ ایک گلی میں سے نکلے۔ ان کی چھاتیوں سے خون بہہ رہا تھا۔

"ہمیں مت مارو۔ ہم نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ہمارا سب کچھ لُٹ چکا ہے۔

ہمیں مت مارو۔"

"کون ہو؟"

"تمہارے مذہب کے۔"

"کھولو دھوتی۔"

"یقین کرو۔ قسم کھا کر کہتے ہیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اور دُہرے ہو کر بولے۔ موت کا خوف اُن کو ہراساں کئے ہوئے تھا اور ایک دم لاٹھیاں، چھرے اور سلاخیں اُن کی طرف بڑھیں اور چشم زدن میں وہ چلتی پھرتی تصویریں مٹی میں مل گئیں۔ ہجوم نے فلک شگاف نعرے بلند کئے۔ دیوتاؤں نے ان نعروں کو سُنا۔ چہ می گوئیاں کیں، اور کان بند کر کے رہ گئے۔

ہجوم چھت کی طرف متوجہ ہوا۔ فتح و نصرت کے نعرے لگاتا ہوا، وہ آگے بڑھا۔ چھت پر کھڑے ہوئے انسانوں کو اُنھوں نے للکارا۔ عورتوں اور بچوں نے چیخیں بلند کیں۔ آدمیوں نے منت کی۔ ناک رگڑی۔ خدا کا واسطہ دیا۔ نوٹوں کے پلندے ہجوم پر بکھیر دئے۔ زیورات کی بارش کر دی۔ اپنے گھروں کی چابیاں بھی پھینک دیں۔ سب ساز و سامان لے جانے کا لالچ دیا۔ صرف جان کی امان کے لئے۔ لیکن یہی شرط تو کڑی تھی۔

کچھ آدمی انتظار سے تنگ آ کر، پرنالے کے راستے چھت پر چڑھ گئے، اور انھوں نے صدر دروازہ کھول دیا۔ اب کیا تھا۔ ہجوم چھتوں پر جا چڑھا اور شکار پر پل پڑا۔ چیخیں، پکاریں، سِسکیاں، آہیں، فضا میں گونج رہی تھیں۔ شور و شغب کا طوفان بپا تھا۔ نہتے انسان مسلح انسانوں کے ہاتھوں شہید ہو رہے تھے۔

اُن کی چیخیں اور آہیں نہ خدا کو موم کر سکیں اور نہ حکام کو - انسانی لاشوں کے ٹکڑے ہوا میں بکھیر دیے جاتے جیسے کسان کھیت میں بیج بکھیرتا ہے - بچّوں کو ہوا میں اُچھال کر ان کے نیچے تلوار رکھدی جاتی اور اس کامرانی پر فضائیں گونج اٹھتیں - عورتوں کو پکڑ کر اُن کی کھلے بندوں عصمت دری کی جاتی، اور پھر ان کے جسم کی قاشیں بنا کر انھیں فضا میں بکھیر دیا جاتا - جیسے سخی مال لٹا رہے ہوں - انسانی لاشوں کے ڈھیر بازاروں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں، چوراہوں پر اور مکانوں کے اندر جمع تھے - کئی دن وہیں پڑے رہے - پولیس اور فوج کی لاریاں آتیں اور ان کو روندتی ہوئی گزر جاتیں - بارش روز مرّہ ہوتی - کچھ روز بعد وہ لاشیں پھول گئیں - سارا ماحول ان کی بو سے متعفن ہوا تھا - فضا سڑنے لگی - کسی لاش کا کوئی وارث نہ تھا - لاش کی نسبت سب کو اپنی جان زیادہ عزیز تھی - جب کسی نے بھی ان لاشوں کو نہ سنبھالا تو گدھوں کو شرم آگئی -

لوگ رات کو بھی نہ سوتے - دشمن کے خطرے نے نیند کو بھگا دیا - مخالف گروہوں کے مسلح دستے بازاروں، سڑکوں اور گلیوں کا چکر کاٹتے - وہ صرف یہ احتیاط کرتے کہ دشمن کے مسلح آدمیوں کو نہ للکارتے تھے - ان کی نظر بے بہتے آدمیوں، بد نصیب عورتوں، اور معصوم بچوں پر ہوتیں -

تب حکام کو سوجھی کہ مذاق بند ہونا چاہیئے - نادر شاہی قتل و غارت کے بعد اُسے لوگوں کو بچانے کی فکر دامنگیر ہوئی - اسے لوگوں کے اس کردار پر غصہ تھا اور سزا کے طور پر اس نے شہر کو فوج کے حوالے کر دیا - گورہ فوجوں کا شہر پر مکمل تسلط ہو گیا - انھیں بھی جوانمردی دکھانے کا اچھا موقع ہاتھ لگا -

وہ اب کسی پر بھی گولی چلا سکتے تھے۔ نہتے آدمی کیا کچھ برداشت نہیں کر سکتے؟

پھر ان کے پاس ٹینک تھے۔ جب وہ چلتے زمین کا کلیجہ لرز اُٹھتا۔ بنیادیں ہل جاتیں، اور چھتیں کانپ اٹھتیں۔ اور ساتھ ہی گولیوں کی آواز ساکن فضا میں گونج اٹھتی۔

رات کو ٹینک فراٹے بھرتے۔ گولیاں دندناتیں، اور محافظ گردہ فلک شگاف نعرے بلند کرتے۔

آدھی رات گئے اچانک شور بلند ہوا۔ "پکڑو، دوڑو، دشمن جانے نہ پائے۔"

ٹینک، اور فوجی گوروں سے بھری ہوئی لاریاں جائے واردات پر پہونچ گئیں۔

گولیاں تڑتڑ برس رہی تھیں۔

ایک چھت سے آواز آئی۔

"صاحب!"

"کیا ہے؟"

"بھا لگا باڑ مہتے دو چور لگی آچے۔" (اس ٹوٹے مکان میں دو آدمی چھپے بیٹھے ہیں۔)

"ابھی دیکھتے ہیں۔"

ایک دم بندوقیں سنبھالے گورے فوجی آگے بڑھے۔ بندوقوں کے فائر ہوا میں گونج اُٹھے۔ مکان کی دیواریں لرز اٹھیں۔

"آدمی اوپر ہے۔" کسی نے کہا۔

"کون ہے اوپر؟ نیچے آجاؤ۔" انگریز کمانڈر کے ارشاد پر ایک ہندوستانی پولس کے سپاہی نے باآواز بلند مشورہ دیا۔

ٹھا۔ ٹھا۔ ٹھا۔ ایک دم رائفلوں نے شور مچایا۔

"مارچ بیک!" کمانڈر کا حکم فضا میں گونج اٹھا۔

اور دور سے مخالف گروہوں کے فلک شگاف نعرے فضا میں اُبھر رہے تھے۔ جیسے وہ خدا کو چڑا رہے تھے کہ "دیکھ ہم کیا نہیں کر سکتے؟ تیرے نظام کے پرخچے اُڑا سکتے ہیں۔ تیری کائنات کو ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔ کیا تو اب بھی ہماری قوت سے مرعوب نہیں ہوتا؟ . . . . ."

اور خدا کے لئے معمہ تھا کہ شکست کا اعتراف کرے یا ایک اور کوشش کر دیکھے انسان نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ اس کی تجسس کی دھن نے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ سائنس کی ایجادات اس کے نظام سے ہی نبرد آزمائی کر رہی تھیں۔ آج انسان ایٹم بم کا موجد بن کر اسی کو للکار رہا تھا۔ جس کی تخلیق، اس نے اَن گنت صدیوں میں کی تھی، آج ایک مٹھی بھر انسان اس کی تخریب کے درپے تھے۔ اس کی سلطنت خطرے میں تھی، اور اس کی حکومت آخری دموں پر۔ وہ کانپ اُٹھا۔

ٹرر، ٹرر . . . . ر . . . . ر

یک لخت مینڈک پھر ٹرا اُٹھا۔

"چپ رہ بدذات۔ بند کر اس بے وقت کے راگ کو!" اس نے آگ بگولا ہو کر اس کے پتھر دے مارا۔

نشہ میں تھی

لڑکیاں اُس کے سَر ہوگئیں۔ دیکھئے! آج تو فائن ویدر ہے، آج تو آؤٹنگ کو چلئے۔
وہ سب ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیاں تھیں۔ دن رات وہی کالج کی چار دیواری!
اونہہ کتنی پابندیاں!! کلاس ختم ہوتے ہی اپنے کمرے میں جا بیٹھو، باہر جانے کی اجازت نہیں۔ کسی سے مل بھی نہیں سکتے۔ پورے ہفتے میں کُل دو گھنٹے کے لئے باہر جانا اور وہ بھی چپراسی کی نگرانی میں، اور چندن کمبخت مقررہ وقت سے ایک منٹ زیادہ باہر رہنے کو تیار نہ ہوتا۔ قیدیوں جیسی اس زندگی سے وہ سب اُکتا گئی تھیں۔ اُنھیں لڑکوں کی زندگی پر رشک آتا تھا۔ جہاں چاہیں پھریں۔ سائیکل اٹھائی اور لارنس چلے گئے، نہر کی سیر کو نکل گئے، شالامار ہو آئے، بوٹنگ کا مزہ لیں یا سینما دیکھیں، کوئی روک نہیں، کوئی پابندی نہیں۔ کیا ہم لڑکیاں باہر کی زندگی سے مرجھا جائیں گی؟ کیا لوگ ہمیں کھا جائیں گے؟ بھلا یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟
آج موسم سُہانا تھا۔ ساون کے بادل آسمان پر اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ باغوں میں کتنی بہار ہوگی۔ پرندوں کے دلکش نغمے۔ موروں کے دلفریب ناچ۔

اُن کے دل میں ایک میٹھی سی کسک جاگ اُٹھی - یہی نظارے تو زندگی کا رس ہیں - ان کے بغیر زندگی پھیکی اور بے مزہ رہتی ہے - انھوں نے مس شیاما کو گھیر لیا - آج تو ضرور کسی باغ میں جائیں گے -

لیکن شیاما پرنسپل تو نہ تھی، مس اگروال کی اجازت درکار تھی اور وہ تھی بڑی سخت - وہ لڑکیوں کو اتنی آزادی دینے کے حق میں نہ تھی - لڑکیاں آزادی کا ناجائز استعمال کرتی ہیں انھیں ڈسپلن میں رکھنے کی ضرورت ہے - ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ چلے تو پیار چمکار سے کام نکالنا چاہیئے - ہمدردی ظاہر کرکے منانا چاہیئے، لیکن رکھنا چاہیئے لڑکیوں کو اپنی ہی مٹھی میں - لڑکیاں بے چاریاں تنگ آکر اُس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتیں - پرنسپل سے بحث کون کرے ؟ مگر آج معاملہ ہی اور تھا - اُنھوں نے مس اگروال کے دفتر کے باہر جیسے ڈیرے ڈال دیئے - تریا ہٹ بھی تھی، اور بال ہٹ بھی - آخر پرنسپل کو ہار ماننی پڑی - اُنھیں فائن ڈے منانے کی اجازت مل گئی -

سب کی سب خوبصورت کپڑوں میں ملبوس، کریم پاؤڈر لگائے، آدھ گھنٹے کے اندر اندر پرے جما کر کھڑی ہو گئیں - پانچ چھ ٹولیاں تھیں - ہر ٹولی کی اپنی اپنی الگ پوشاک تھی - گلابی، چاکلیٹ اور سبز رنگ کی نمائش ہو رہی تھی - ایک ٹولی کی سر سے پاؤں تک ایک ہی رنگ کی پوشاک تھی - جوتا بھی اُسی رنگ کا تھا - سیر سپاٹے میں جسم پر دھوتی کون منڈھے ؟ قمیص، شلوار ہی زیب دیتا ہے - سینے پر سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دوپٹہ - مس اگروال کو اسی پر تو اعتراض تھا کہ لڑکیاں باہر نکلتی ہیں تو غارتگری کے پورے سازو سامان سے

لیس ہو کر جاتی ہیں۔

اور شیبا ماکو لوگوں اور ان کی حرکتوں پر غصہ آرہا تھا۔ اس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں جیسے انہوں نے لڑکیاں پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ بھلا اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ ایک کالج کی لڑکیاں تو یہاں ... کی طرف جا رہی ہیں۔ کیا وہ ممنوع علاقہ ہے؟ کیا اس جگہ ان سے پہلے کوئی نہیں گیا؟ لوگ کیوں حیران ہو ہو کر دیکھ رہے ہیں؟ ان کو واسطہ ... ان کا جی چاہے گا جائیں گی۔ لوگ کیوں دخل انداز ہوں؟ ان میں تہذیب تو نام کو بھی نہیں۔ جاہل کہیں کے! بدتمیز! لعنت ہے ایسی تعلیم پر۔ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد بھی نہ تو زبان پر قابو ہے، نہ دل اور آنکھوں پر۔ سڑکوں پر، سنیما میں، اسٹیشن پر جو منھ میں آئے بکتے ہیں۔ شاید ان کی اپنی ماں بہنیں مر گئیں ہیں۔ اگر ان سے بھی کوئی مذاق کرے تو شاید اس وقت بھی یوں ہی بدتمیزی سے ہنسیں گے۔ بے غیرت کہیں کے! آزادی کے لئے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ آزادی مل گئی، مگر یہ آزادی کو جانیں کیا؟ عورتوں کی اتنی معمولی سی آزادی بھی انہیں اکھرتی ہے۔ ان کا چاردیواری سے باہر نکلنا بھی انھیں حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ بوڑھوں کو بھی تو شرم نہیں آتی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور ان کالج کے چھوکروں نے تو شرم و لحاظ تج ڈالنے کی جیسے قسم ہی کھائی ہے۔ کیا پڑھتے ہیں کالجوں میں! اس روز پروفیسر شرما کہہ رہے تھے کہ دیوار پر عورتوں کی تصویریں بنا کر ان کے نیچے گندی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ ایسی ہے ان کی تعلیم۔ کیا فائدہ ایسی تعلیم سے؟ نہ معاش کا وسیلہ نہ تہذیب کا ذریعہ!

نورجہاں کے مقبرے کے پاس پہنچ کر کالج کی بس رُک گئی۔ چندن اور شکھر نے سامان اُتارا، پھر گھاس پر دری بچھا دی۔ شیاما وہیں بیٹھ گئی، مگر لڑکیاں کیوں بیٹھتیں؟ وہ تو قید سے چھوٹ کر آئی تھیں۔ شہر سے دور، کالج اور ہوسٹل سے دور۔ لیکن جب گھوم پھر کر تھک گئیں تو آرام کے پاس بیٹھ گئیں۔ مگر یہ بیٹھنا آرام کرنے کے لئے نہیں تھا۔ سورن نروز نے تجویز پیش کی، کونا چھپا کی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تجویز کثرتِ رائے سے منظور ہوئی۔ شیاما کو بھی کھیل میں حصہ لینا پڑا۔ سب کی سب ایک گول چکر بنا کر بیٹھ گئیں۔ ایک دوپٹے کو بل دے کر کوڑا بنایا گیا۔ ایک لڑکی یہ کوڑا لئے کر چکر کے گرد گھومنے لگی۔ وہ گھوم رہی تھی اور سب لڑکیاں آواز ملا کر گا رہی تھیں:

کونا چھپا کی جمعرات آئی اے

جیہڑا اگے پچھے ویکھے اوہدی شامت آئی اے

چکر کاٹنے والی بھی ان کے ساتھ گا رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی گردش کر رہی تھیں۔ جس کسی نے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی شڑاپ سے کوڑا اس کی پیٹھ پر پڑا لیکن مارنے والے کے ہاتھ بھی تو نازک ہی تھے۔ گھومتے گھومتے اس نے کوڑا ایک لڑکی کے پیچھے رکھ دیا اور چکر کاٹ کر اسے آن دبایا۔ کوڑا چھین کر وہ بھاگی اور ہنستی بل کھاتی چکر کاٹ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھی پھر دوسری لڑکی کی باری آئی پھر تیسری کی...... ہنسی اور تالیوں کی بہار۔ پُرسکون مقبرہ کی فضا میں جوانی کے نغمے اور ہنسی اور قہقہے۔ شیاما بھی کالج کے زمانے میں اس کھیل کو دکو بہت پسند کرتی تھی۔ مقبرہ جہانگیر کے احاطے میں انہوں نے بھی

اپنی سہیلیوں اور ہم جماعتوں کے ساتھ بارہا یہی کھیل کھیلا تھا۔ ایک دفعہ وہ یہی گیت گاتی ہوئی چکر کے گرد گھوم رہی تھی۔ اُس نے احتیاط سے کوڑا مس بوس کے پیچھے رکھ دیا وہ بھاری جسم کی تھیں۔ آسانی سے بھاگ نہ سکیں۔ پھر کیا تھا۔ پرنسپل کی پیٹھ تھی اور شیاما کا کوڑا۔

اچانک شیاما کی پیٹھ پر کوڑا پڑا وہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھی۔ اصل میں وہ بھول ہی گئی تھی کہ کھیل ہو رہا ہے۔ اُٹھتے ہی بھاگی۔ بھلا بلونت سے کیا مقابلہ! پھر شکاری نے شکار کو بے خبری میں آ دبوچا تھا۔ بلونت نے اُس کی پیٹھ پر بے طرح کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ شیاما کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اُسے اپنی جگہ بہت دور معلوم ہونے لگی۔ چکر کو چھوڑ کر ایک طرف بھاگ نکلی۔ بلونت کے کوڑے اور بھی زناٹے سے پڑنے لگے۔ قریب ہی ایک جھاڑی تھی۔ شیاما نے جان بچانے کے لئے اُس کی آڑ لی۔ بلونت اُس کے پیچھے لپکی۔ شیاما نے اُسے جھاڑی کا چکر دینا چاہا۔ بلونت نے اُس کا پیچھا کیا۔ دونوں جھاڑی کے گرد آگے پیچھے بھاگنے لگیں۔ لڑکیوں کا گھیرا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ سب بھی اس دوڑ کا تماشا دیکھنے وہیں آ گئیں۔

شیاما پوری طاقت سے اس طرح دوڑ رہی تھی جیسے جانور شکاری سے جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے۔ بلونت کو اُسے پکڑنے کا ایک اور ڈھب سوجھا۔ وہ پلٹ پڑی۔ مگر سب لڑکیاں چلانے لگیں۔ "فاؤل، فاؤل!" کوڑا بلونت کے ہاتھ سے چھین لیا گیا۔ شیاما کا پیچھا چھوٹا۔

کچھ دیر بعد سب نے اُس سے ملکہ نورجہاں کے عشق و محبت کی کہانی سُنانے کی

فرمائش کی۔ شیاما کالج میں تاریخ پڑھاتی تھی۔ کیسا دلکش تھا اُس کے پڑھانے کا انداز وہ جس کسی تاریخی کردار پر بولتی، چلتے پھرتے انسانوں جیسا معلوم ہونے لگتا۔ اسکی زبان میں، وہ لوچ وہ اثر، وہ رس تھا کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ کالج کی بیشتر لڑکیاں صرف اس لئے ہسٹری لیتی تھیں کہ مس شیاما تاریخ پڑھاتی ہیں۔

سب لڑکیاں فلم "پکار" دیکھ چکی تھیں۔ پکار کی کہانی کو وہ نورجہاں کا ہی افسانہ سمجھتی تھیں۔ اُن کی نظر میں نورجہاں ایک سہانے رسیلے رومان کی ہیروئن تھی۔ لڑکیوں کو یہی توقع تھی کہ مس شیاما اس رومان کو مقبرہ نورجہاں کی اس فضا میں اپنے خاص انداز میں بیان کر کے ان کے دل کی گدگدی کو میٹھے میٹھے ٹہوکے دیں گی۔ مگر شیاما نے کچھ اور ہی کہنا شروع کر دیا۔ نورجہاں کی ذات سے عشق و محبت کی ایک داستان منسوب ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "پکار" کی کہانی تاریخی واقعات پر مبنی نہیں ہے۔ مہرالنسا اور سلیم کا بھولے بھالے لقا کبوتروں کے جوڑے سے شروع ہونے والا عشق محض ایک افسانہ ہے جس کا مصرف داستان نگاری سے زیادہ تسکینِ جذبات ہے۔ یہ کہنا کہ جہانگیر کے دل میں شیر افگن کی طرف سے نورجہاں کا شوہر ہونے کی بنا پر کینہ تھا بالکل غلط ہے۔ اور یہ تو سراسر اتہام ہے کہ اُسے جہانگیر نے ہلاک کرایا۔ شیر افگن حکومت کا باغی تھا۔ حاکم وقت نے اُسے مروا ڈالا۔ ہر جگہ ہر زمانے میں باغیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا رہا ہے اور ہر حاکم وقت یہی کرتا آیا ہے۔ جہانگیر نے اس واقعہ کے چار سال بعد تک مہرالنسا سے شادی نہیں کی۔ اگر عام روایت درست ہے تو کیوں نہیں کی؟ اگر جہانگیر کو مہرالنسا سے عشق ہی ہوتا جیسا کہ بنایا جاتا ہے تو بھلا جہانگیر جیسا

سن چکا، ایک نہ دو پورے اڑتالیس مہینے چین کی نیند سو سکتا تھا؟ ایک عاشق کے لیے
ہجر و فراق کے چار سال چار سو برس کے برابر ہوتے ہیں؛ اور پھر جہانگیر جیسا منتوالا عاشق
اور میں پوچھتی ہوں اتنے طویل عرصہ تک اُسے انتظار کی ضرورت بھی کیا تھی؟ دو دل راضی
تو کیا کرے گا قاضی۔ عام روایت تو یہی ہے نا کہ مہرالنسا، خود اس مینا بازار والے دن
عاشق ہو چکی تھی۔ اس لحاظ سے شیر افگن کے ساتھ اُس کی شادی محض اکبر کی دراز دستی
سے ہو گئی۔ مہرالنسا اس شادی سے کب خوش ہو گی۔ دل جہانگیر کو دے بیٹھی تھی تو اسی سے
بیاہ بھی کرنا چاہتی ہو گی۔ شیر افگن سے لاکھ شادی ہو چکی تھی مگر اپنے طور پر تو اُس نے
جہانگیر ہی کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا رکھا ہو گا۔ پھر دلّی لائے جانے کے بعد جہانگیر کی ماں کے
پاس محل میں رہتے ہوئے، کیا مہرالنسا کے دل میں وہی کجلائی ہوئی چنگاری دوبارہ لو
نہ دینے لگی ہو گی ضرور دینے لگی ہو گی۔ ادھر جہانگیر بادشاہِ وقت تھا اور اُن دنوں بادشاہ
کا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ جہانگیر کے ایک ہلکے سے اشارے کی دیر تھی۔ مہرالنسا اس کے
پہلو میں آ جاتی یا لے آئی جاتی۔ شیر افگن کے قتل کے بعد مہرالنسا کی عدت چند مہینوں
کے اندر پوری ہو گئی۔ چار سال نورجہاں اور جہانگیر کے الگ الگ رہنے کے معنی؟ اور
وہ بھی ایک محل میں رہتے ہوئے۔ کس طرح مان لیں کہ مہرالنسا، کو جہانگیر سے اور
جہانگیر کو مہرالنسا سے عشق تھا، محبت تھی! ہرگز نہیں۔ یہ سب لوگوں کی گھڑنت ہے۔
لڑکیاں سن سی ہو کر رہ گئیں۔ انھیں تو توقع تھی دلوں کو گدگدانے والی داستان
سُننے کی۔ وہ اور ہی کچھ گانے لگی۔ اُس نے توقعات پر پانی پھیر دیا۔ اُس نے ایک
نورجہاں ہی نہیں، پوری نسائیت کی توہین کر ڈالی۔ بھلا عشق و محبت کا سہانا تذکرہ شامل
نہ ہو تو نورجہاں کی کہانی میں رکھا ہی کیا ہے۔ اس کے بغیر تو وہ صدیوں پہلے کی ایک

ملک کے روکھے پھیکے اور خشک حالات کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی - نور جہاں کے نام کو اسکی
پریم کتھا ہی نے تو زندہ کیا ہے - شیاما نے تو اس داستان کو رومانیت کے جادو ہی
سے محروم کر دیا ہے - بڑی آئی مؤرخ کہیں کی - انگریزی میں ہسٹری کی کوئی نئی
کتاب پڑھی ہوگی اُس میں کسی سٹری انگریز ہسٹورین نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے
انٹ سنٹ لکھ مارا ہوگا کہ تھیسس میں کشش پیدا ہو جائے اور محقق کہلانے لگے - اُنھوں
نے اسی کی کہن کو اپنا شروع کر دیا -

شدرشن آگے بڑھ کر بولی " اچھا جی مس شیاما آداب چائے پئیں "
کچھ لڑکیاں مسکرائیں ، کچھ منھ پھیر کر ہنسیں - بہر حال چائے شروع ہوگئی - مگر شیاما
نے جونہی پیالی اٹھائی اُسے اپنی گذشتہ زندگی کی تصویر اُس میں تیرتی ہوئی نظر آنے
لگی - اُس میں کوئلے کے سہانے کھیل کے ساتھ ساتھ الھڑ جوانی کی بدمستیوں کے ہلکے
ہلکے نقوش بھی تھے - زندگی کے بیتے ہوئے لمحوں میں سے ہر لمحہ ایک نغمہ تھا جس کی
ہر الاپ میں ہزاروں آہیں سرسرا رہی تھیں - اس کی ہر لہر میں کتنے گرداب بل
کھا رہے تھے - اس کی لمبی لمبی گھڑیوں میں کتنی پورن ماشیاں اور کتنی اماوس کی
راتیں مرجھائی پڑی تھیں اور کتنے ساون ! اور کتنے بسنت !!

وہ ان دنوں زندہ دلی کی ایک تصویر بنی رہتی تھی ، روتوں کو ہنساتی ،
روٹھوں کو پل بھر میں منا لیتی - اُسے اپنے میٹھے گانوں سے دلوں کو لُبھا لینے میں کمال
حاصل تھا - اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسّم ناچتا رہتا اور آنکھوں میں شرارت -
جب وہ شرارت پہ اُتر آتی تو کسی کو نہ بخشتی - کالج کی پرنسپل تک کو بھی نہیں -
اس روز وہ کالج کی اور لڑکیوں کے ساتھ " فائن ڈے " منانے

یہاں آئی تھی۔ جوان دلوں کو یہ کیا مذاق سوجھا کرتا ہے، مقبروں پہ بیا جا کے رنگ رلیاں! مگر یہی تو ہے شباب، جو موت کو للکارتا ہے، اس پر بھی قہقہے لگاتا ہے۔

کوند چھپا گئی ہیں اس نے، اس روز مس بوس کو اپنے کوڑے پر رکھ لیا، اور کوڑے مار مار کر اس کی چمڑی اُدھیڑ دی۔ جب مس بوس بے دم ہو کر گری تو لڑکیوں نے کھلکھلا کر تالی پیٹ دی اور اتنی ہنسیں، اتنی ہنسیں کہ ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے ...... اس وقت اس کی نظر ایک طرف کو اُٹھی۔ ایک لڑکا ایک درخت کے نیچے کھڑا یہ تماشا دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ شیاما کو اس کی یہ نظارہ بازی بہت بُری معلوم ہوئی، لیکن وہ چُپ رہی...... پھر اُس کی سہیلی پدما اسے باتوں باتوں میں ایک طرف کو لے گئی اور ایک جھاڑی کے پاس لے جا کر بٹھا دیا۔ وہاں وہ لڑکا بھی آ گیا۔ شیاما اٹھنے لگی تو پدما نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ ارے بھاگنے کی کوئی وجہ بھی! یہ تو میرا بھائی ہے۔ سُریش چندر، لا کالج میں پڑھتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ دریا کی سیر کو آیا تھا، وہ چلے گئے یہ ادھر آ نکلا۔ یُوں ہی پھرتا پھراتا۔ شیاما نے جھجکتے جھجکتے اُس کی طرف دیکھا، اُف! کتنا خوب صورت اور صحت مند! لمبا قد، بھرا بھرا جسم، سُرمئی آنکھیں گھنگھریالے بال!!!

مُلاقاتیں ہونے لگیں۔ اور ملنے جُلنے میں کوئی خاص مشکل بھی پیش نہیں آئی۔ وہ سُریش چندر کی سگی بہن پدما کی سہیلی تھی۔ سہیلی کے گھر جانے سے اُسے کون روک سکتا تھا، گرمیوں کی چھٹیاں آئیں۔ ہوسٹل خالی ہونے لگا۔ شیاما نے دل سے پوچھا، گھر جاؤں یا نہ جاؤں؟ والدین کے خط پر خط آ رہے تھے۔ مگر...... سُریش، اور اُس کی مُلاقاتیں؟ والدین کو ٹالنے میں کوئی دُشواری نہ ہوئی۔ اُس نے

کہہ دیا۔ چھٹیوں کے بعد امتحان ہوگا اور اُس میں انگریزی اور ایکونومکس میں پہلے ہی سے کافی کمزور رہوں، گھر آئی تو اب تک کا پڑھا گنا بھی سب بھول بیٹھوں گی' البتہ یہیں رہوں تو ٹیوٹر سے پڑھ سکتی ہوں۔ پروفیسر ستیش چندر جی کمزور طالبات کی کمی پورا کرانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ وہ پرنسپل کے کہنے سننے اور زور دینے سے مجھے پڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں' ورنہ ابھی چند دن کی بات ہے اُنھوں نے وزیرِ مالیات کی اکلوتی لڑکی کی ٹیوشن لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ باپ نے لکھا۔ اگر یہ مضمون اتنا مشکل ہے تو کیا ضرورت ہے مغز پچی کرنے کی؟ جیوگرافی کیوں نہ لی جائے۔ اُس نے جواب میں لکھ بھیجا کہ آپ نہیں جانتے، مضمون کوئی بھی لیا جائے، ٹیوشن ضروری ہوتی ہے۔

پرنسپل کو اس نے فادر کا وہ خط جا دکھایا جس میں پروفیسر ستیش چندر کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ پرنسپل نے بھی منظوری دے دی ٹیوشن شروع ہو گئی۔ ہوسٹل میں تین چار لڑکیاں رہ گئی تھیں اور دو تین نوکرانیاں۔ شیاما نے پڑھنے کے لئے کامن روم کا انتخاب کیا۔ یہ جگہ سب سے الگ تھی۔ پڑھنے کے لئے ایسی ہی تنہائی کی جگہ ہونی بھی چاہیے۔ پروفیسر صاحب' صبح ہی کتاب سنبھالے، تشریف لے آتے، لیکن اکثر وہ کسی اور ہی مضمون کی نکلتی۔ کبھی دوسری جماعت کی کتاب، کبھی ساتویں جماعت کا حساب۔ ایک دفعہ تو پروفیسر صاحب دھوبی کے حساب کی کاپی ہی اُٹھا لائے، جس پر دونوں خوب جی کھول کر ہنسے۔

"آج کیا پڑھائیے گا پروفیسر صاحب!" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"ایکونومکس"۔ پروفیسر صاحب جواب میں بولے۔
"اسی کتاب سے؟ کیا یہ مارشل کی کتاب ہے؟"
"نہیں اس کے باپ کی"۔ اور دونوں ہنس پڑے۔
"آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ مارشل کا باپ دھوبی تھا؟" وہ ہنسی روکتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"دیکھئے"! پروفیسر صاحب نے تنبیہہ کی۔ "پڑھائی کے وقت ہنسی مذاق نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک کہا ہے۔"
"وہ کس طرح؟"
"ایکونومکس میں دھوبی کا حساب بھی شامل ہے۔ تم عورتوں کو یہ کام نہیں آتا۔"
"ہم عورتیں یہ کام کرنا بھی نہیں چاہتیں۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"
"کیوں؟"
"یہ کام بنیوں کا ہے۔"
"تم بڑی نٹ کھٹ ہو!"
دونوں پھر ہنسنے لگے۔ کامن روم کی دیواریں بھی اُن کی اس ہنسی میں اس وقت تو شریک معلوم ہوتیں، مگر مسٹر تیش کے چلے جانے کے بعد وہ سیمنٹ کی جڑی ہوئی بے جان اینٹیں نظر آنے لگتیں۔ ایک یہ دیوار ہی کیا، سارا ہوسٹل ہی قبرستان دکھائی دیتا اور بچی کچھی تین چار لڑکیاں اور نوکرانیاں چلتی پھرتی قبریں۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی، اس لئے وہیں پہنچتی جہاں زندگی تھی؛ پدما کے گھر۔
صبح اُٹھتے ہی نہا دھو کر خوب بناؤ سنگار کرتی اور بہتر سے بہتر ساڑھی

یا سوٹ پہنتی - سرمہ لگانے میں وہ کتنی ماہر ہوگئی تھی۔ دُنبالے کی نوک کو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز بنانے کی کوشش کرتی تاکہ سُریش کو زیادہ سے زیادہ گھائل کر سکے۔

ہوسٹل میں اُس کا دل ہی نہیں لگتا تھا - نہ چمن میں وہ پھول دکھائی دیتے جو موسمِ بہار میں کھلا کرتے ہیں، نہ وہ سبزہ - جھلسی ہوئی گھاس ہی گھاس ہوتی اور سب طرف اُداسی ہی اُداسی، اندر بھی، باہر بھی، سڑکوں پر بھی۔کیا موسم ہوتا تھا! بازار تک بے رونق نظر آتے - رونق اور دلبستگی کا سامان نہیں تھا تو بس سریش کے گھر پر- اُسے وہیں چین آتا - مگر ایک دن اُس نے سوچا، یہ کھیل اس طرح کب تک جاری رہ سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ چھٹیوں تک چھٹیاں تو ختم ہو جائیں گی - وہ کانپ اُٹھی - تو کیا پھر ملنا جلنا بند ہو جائے گا؟ کیوں؟ اس میں کیا بُرائی ہے؟ دنیا اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتی - اجی بس دنیا! دنیا! دنیا!!! جیسے دنیا ہی سب کچھ ہے - ہم کچھ بھی نہیں - ہماری پسند نا پسند کچھ نہیں۔ ہمارے دل، ہمارے جذبات کی کوئی ہستی نہیں - یہ کون ہے باہر؟ وہ آئے ہیں کیا؟ لپک کر باہر نکلی - لیکن وہاں کوئی نہ تھا -

"مس صاحبہ چائے" چندن نے اُسے ماضی کے خواب سے جگایا - چائے کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا - کچھ لڑکیاں اپنے حصّے کی چائے پی کر گھاس کے ایک اور قطعے پر جا نکلی تھیں اور وہاں بیٹھ کر ماہیا گا رہی تھیں - باقی اور سب بھی اپنی اپنی پیالی ختم کر کے وہیں پہنچ گئیں - شیاما کو بھی اُن کے ساتھ جانا پڑا - لڑکیوں نے دو ٹولیاں بنا کر مقابلے پر ماہیا شروع کر دیا۔

"میریا وے ماہیاجے منڈے ایتھے آون گے
سینڈل کھول اسیں انہاں دے سراں چڑھاواں گے"

(اے میرے ماہیا! اگر لڑکے یہاں آئیں گے تو ہم سینڈل کھول کر ان کے سروں پر چڑھائیں گے) سب لڑکیوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔ جو فضا کو چیرتا ہوا شہر کی جانب بھاگ چلا جیسے لڑکوں کو خبر کرنے ہی جارہا ہے۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر ماہیا سننے لگی۔ لڑکیاں کتنے شوق اور اُمنگ سے گا رہی تھیں۔ وہ بھی اسی والہانہ انداز سے ستریش کی محبت کے گیت گایا کرتی تھی۔ ہر وقت اُسی کے خیال میں مگن رہتی تھی۔ کیا اُسے بھی میرا اتنا ہی خیال ہے؟ ایک دن اُس نے اپنے سے پوچھا۔ اُس کی باتوں اور آنکھوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے ستریش سے پوچھنے کا فیصلہ کرلیا۔

لیکن دوسرے ہی دن اُسے بخار نے آدبایا اور کئی روز تک پیچھا نہ چھوڑا۔ اس دوران میں نہ ستریش اُسے پڑھانے آیا نہ پدما ملنے آئی۔ کیا اُن دونوں کو اس کی بیماری کی خبر نہیں؟ چپراسی کو بھیج کر خبر کرادینی چاہئے۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو وہ خود ہی اُن کے گھر جائے گی۔

دو دن بعد، وہ ستریش اور پدما کے دروازے پر پہنچی تو تو..... ٹھن ٹن...... ن۔ اُس کے دل کے تار جیسے ایک دم بج اُٹھے۔ دروازے پر قفل تھا۔ معلوم ہوا مکان خالی کیا جاچکا ہے۔

سُدرشن کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ سُدرشن تالیاں بجا بجا کر چلا رہی تھی۔ "اب پروفیسر شیاما، ماہیا سُنائیں گی؟"

ارے مس صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو!!! لڑکیاں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں

وہ سر درد کا بہانہ کر کے ایک طرف جا کر لیٹ گئی۔ ماہیا بند ہو گیا۔ سب لڑکیاں سدرشن کے سر ہو گئیں۔ جب ساری بات معلوم ہے تو کیوں اُن سے ماہیا کے لئے کہا۔

"بیچاری مس شیاما! جانتی ہو ان کو سنانے والی کی گیا سزا مقرر کی جا چکی ہے؟" آشا نے اُسے ڈانٹا۔

سدرشن اپنی بھول پر افسوس کرنے لگی شیاما تنہائی چاہتی تھی۔ سب لڑکیاں پرے ہٹ گئیں۔ سدرشن اُس کا سر دبانے لگی۔ شیاما کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے پردے پر ماضی کی تصویریں پھر اُبھرنے لگیں۔ سُرکیش سے اُسکی مُلاقات پھر کبھی نہ ہوئی۔ اُس نے کوئی خط بھی نہ بھیجا۔ ہاں پدما کا ایک خط آیا تھا "ہم لوگ اچانک کلکتہ آ گئے تھے۔ چند ہی دن بعد بھیّا کی شادی ایک بڑے امیر گھرانے میں ہو گئی۔ بھابی بڑی خوب صورت ہے اور اس کے ماں باپ نے ہزاروں کی مالیت کا جہیز دیا ہے۔ بھیّا بہت خوش ہیں۔ اصل میں یہ شادی انھوں نے اپنی پسند ہی سے کی ہے۔

"مس صاحبہ اُٹھئے" شیکھر کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "گھر چل رہی ہیں؟"

آنسو

"ابے او رامو کے بچے! سنتا نہیں؟ بابو کو پانی دے۔" پنڈت نے چلا کر کہا۔
اُس نے اُٹھ کر، نل کے پاس جا کر، گلاس دھویا اور پانی سے بھر کر بابو کے پاس رکھ دیا، پھر برتن مانجھنے میں محو ہو گیا۔ پنڈت نے پھر شور مچایا۔ "ابے تھالیاں کیوں نہیں لاتا؟" اب وہ منجھی ہوئی تھالیاں لے کر اُٹھا اور اُنھیں نل پر دھو کر پنڈت کے پاس رکھ آیا، لیکن ابھی برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔
اُس کا سفید اور گورا رنگ کوئلوں کی کالک نے چھپا رکھا تھا۔ چہرے پر، اُس کالک کے دھبے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ اُس کی قمیص کندھوں کے اوپر سے پھٹی ہوئی تھی اور بازو کے پاس سے لٹک رہی تھی۔ جب زکام کی زیادتی سے ناک کی رطوبت بہنے لگتی، تو وہ سُڑکتے ہوئے، قمیص کے ٹکڑے سے اُسے صاف کر لیتا۔ رطوبت کی لکیر کان تک آ پہنچتی اور اُس پر کالک جم جاتی۔
راکھ کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے، اُس نے چھوٹے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا اور اُن میں سے کٹوریاں چھانٹنے لگا، کیونکہ پنڈت نے اب یہ طلب کی تھیں۔

چھوٹے آلوؤں کو وہ نالی میں پھینک دیتا اور پھر ان کٹوریوں کو راکھ اور کوئلہ سے ملتا۔
رامو کے باپ کی اپنی زمین تھی جس میں وہ سبزی اور اناج پیدا کرتا تھا۔
گاؤں سے ٹوکروں میں آلو ڈال کر، اُس کا باپ اور بڑا بھائی گلّا با، پانچ میل کا فاصلہ طے کرکے شہر جاتے، واپسی پر تھوڑے پیڑے یا جلیبیاں لاتے۔ کبھی کبھی جب اُسے بھی شہر جانے کا موقع نصیب ہوتا تو وہ بھی ہری رام حلوائی کی دوکان سے ایک آنہ کی ریوڑیاں لیتا اور اُن میں سے آدھی لاکر شوبھا کو دیتا۔ گاؤں میں آم کا ایک بڑا درخت تھا جو برسات میں آموں سے لد جاتا۔ وہ، اُس کے دونوں چھوٹے بھائی کیسر اور جیتا، اُس کا ساتھی نندو اور بہاری کی لڑکی شوبھا، اکٹھے مل کر آم کے پیڑ پر حملہ کرتے۔ وہ کچّے آموں تک کو نہ چھوڑتے تھے۔ نندو کی بانسری شوبھا کو بہت بھاتی تھی۔ جب چشمے کے کنارے، شوبھا کہتی "نندو، ماہیا گاؤ" تو رامو کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اُس کا دل چاہتا کہ بانسری چھین کر نندو کے ہونٹوں پر توڑ دے اور آئندہ کے لئے اُنھیں بالکل بیکار کردے۔ بچپن سے اُس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح شوبھا کو خوش رکھ سکے۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اُس کا دل کھِل اُٹھتا تھا۔ لیکن شوبھا ہمیشہ بانسری کے لئے بیتاب رہتی۔ رامو سوچتا، کیوں نہ وہ بھی بانسری خرید لے اور بجانا سیکھ لے۔ لیکن پیسے کہاں سے لائے؟ نندو کا باپ اُس کے باپ سے زیادہ امیر تھا، تبھی تو اُس نے بانسری خرید لی تھی۔ پھر سیکھے گا کہاں؟ نندو سے وہ ہرگز نہیں کہے گا۔ اپنے رقیب سے بھلا وہ ایسی التجا کیسے کرسکتا تھا؟ لیکن اُس نے دل میں پختہ تہیّہ کرلیا کہ اس بازی میں وہ نندو کو ضرور مات دیگا اور اُسے نیچا دکھائیگا۔ نندو کے رویّہ نے اُس کے دل میں اُسکے خلاف

انتقام کے شعلوں کو بھڑکا دیا تھا ——

ساون کے شروع میں شہر میں ایک بھاری میلہ لگتا۔ گرد و نواح کے دیہات سے لوگ میلہ دیکھنے آتے اور اُس کے گاؤں کے لوگ بھی وہاں پہنچتے۔ بچّوں کو خرچ کرنے کے لئے پیسے ملتے، لیکن رامو مٹھائی خرید کر خود نہ کھاتا، شوبھا کے لئے رکھ لیتا۔ ایک دن جب اُس نے شوبھا کو مٹھائی دی، تو وہ پہلے کی طرح خوش نہ ہوئی۔ اسکے چہرے پر غم کے آثار دیکھ کر وہ گھبرا اُٹھا۔ اُس نے پوچھا "کیا میلے میں کسی نے تجھے چھیڑا تھا، کیا کسی نے سخت الفاظ کہے تھے؟"

"تم دیکھتے نہیں ہو، رامو! وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی" وہ لڑکی جو چشمے کے پاس بیٹھی ہے، اُس کے بُندے کتنے خوبصورت ہیں؟"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"نہ جانے مجھے بھی ایسے بُندے نصیب ہوں گے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں؟" اُس نے بے ساختہ کہا۔

"کیا آسمان سے آئیں گے؟"

"آسمان سے کیوں؟ میں لا کر دوں گا!"

"تم!" وہ اس بات کو ناقابلِ یقین تصور کر کے حیرانی سے بولی۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"جاؤ ہٹو" وہ لاپرواہی سے بولی "یہ بھی کوئی پھلکو کے آم ہیں؟ ان کے لئے روپیہ چاہئے اور تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں"

کتنے تلخ الفاظ تھے، لیکن سچائی سے پُر۔ اُسے اپنی بے بسی پر غصہ آ گیا۔

شوبھا کو خوش رکھنے کے لئے وہ آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ کے لئے وہ اپنی جان قربان کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کتنا بدنصیب تھا کہ اس کی ایک ادنیٰ سی خواہش پوری کرنے کی بھی سکت اُس میں نہ تھی۔ اُسے اپنی کمزوری پر رحم آ گیا۔ کاش اُسے ایک بے پناہ قوت میسّر ہو سکے اور وہ، میلے کی تمام عورتوں کے گہنے چھین کر، اُنھیں اپنی شوبھا کی نذر کر سکے۔

مرگ نینی کی خوبصورت آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے بڑے بڑے آنسوؤں نے، اُس کے دل میں ایک تلاطم بپا کر دیا۔ اُس کے دبے ہوئے احساسات سطح پر اُبھر آئے۔ اُس کے چھپے ہوئے جذبے، آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے جاں بلب حوصلے جانبر ہو رہے ہوں، لغزش کھاتے ہوئے ارادے سنبھل رہے ہوں، اور لرزتے ہوئے وَلولے جواں ہو رہے ہوں۔ ایک ہی جذبہ اُس کے دل پر غالب تھا، ایک ہی خیال اُس کی روح پر قابض تھا۔ اچانک اُس کے دل کی لہروں میں ایک طوفانی ہیجان بپا ہوا اور اُس نے سینہ تان کر کہا۔

"شوبھا! میں تمھاری خواہش پوری کروں گا!"

"کیا کہا رامو؟" جیسے وہ خواب سے چونک کر بولی۔

"ٹھیک کہتا ہوں!"

"لیکن کیسے؟"

"تمھیں اس سے مطلب؟"

"کیا چوری کرو گے؟"

"چھی چھی۔ بھلا چوری کیوں کروں گا؟ کیا میرے ان بازوؤں میں طاقت نہیں؟

ہیں کما کر لاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ شہر چلا گیا۔

اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی پیٹھ پر لوہے کے ہتھوڑے چل رہے ہیں اور وہ اُن کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، پنڈت تڑا تڑ مکوں کی بارش اور گالیوں کی بوچھار کر رہا تھا۔

"اُلّو کا پٹھا! کیا رات کو آگ بجھاتا رہتا ہے جو اس وقت سو رہا ہے؟ اتنی آوازیں دیں اور تو سُنتا ہی نہیں! کتنے گاہک کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں اور تو مزے سے خواب دیکھ رہا ہے! حرامی، اگر کام نہیں کر سکتا تو گھر جا کر ماں کے پاس سو رہ۔"

وہ واقعی قصور وار تھا جو کام کرتے کرتے سو گیا تھا، لیکن وہ رات کو بھی کب چین سے سو سکتا تھا۔ بمشکل تمام وہ رات کو دو بجے کام سے فارغ ہوتا اور پانچ بجے صبح دینا باورچی گالیاں دے کر اور لاتیں مار کر اُسے جگا دیتا اور پھر سارا دن کا کام۔ ملک الموت کی طرح پنڈت اُس کے سر پر سوار رہتا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، میلی قمیص اور گندی دھوتی پہنے، وہ غلاظت کی چلتی پھرتی تصویر تھا، لیکن سانڈ کی طرح پلا ہوا۔ اُس کی آواز میں گرج تھی اور اُس کے تمام نوکر اُس سے خائف رہتے تھے۔

وہ ٹین کے ڈبے میں سے گھی نکال، ایک لوہے کے کڑچھے میں ڈالتا اور اُس میں کٹی ہوئی پیاز ملا کر آگ پر رکھ دیتا۔ اس کے میلے ہاتھوں کی زد میں آ کر پیاز اور بھی غلیظ ہو جاتی۔ منڈیر پر دو بڑے برتنوں میں دال اور سبزی تھی۔ کڑچھے سے دال اور سبزی نکال کر وہ دو کٹوریوں میں ڈالتا۔ کچھ دیر کے بعد وہ گھی اور پیاز کٹوریوں میں اُنڈیل دیتا۔ اِس عمل سے ایک آواز پیدا ہوتی جو پنڈت کی کرخت آواز سے بھی زیادہ دلخراش

دتی۔ لیکن وہ ان دونوں آوازوں کا عادی ہو چکا تھا۔ دونوں کٹوریوں کو اٹھا کر وہ تھال میں رکھ دیتا اور کٹی ہوئی پیاز کے کچھ ٹکڑے تھال میں رکھ کر آواز دیتا "بابو ڈانگی رام"۔

اور لچھمن اس تھالی میں راکھ سے لپٹی ہوئی دو روٹیاں رکھ کر بابو ڈانگی رام کے آگے رکھ دیتا۔ ایک طرف سے آواز آتی۔ "پانی! پنڈت چلا کر کہتا "چل بے رامو کے بچے! بابو چیلا رام کو پانی دے"۔

پھر آواز آتی۔ "چپاتی" اور پنڈت پھر چلاتا ـــــ "سردار روپ سنگھ کو روٹی دے"۔ پھر بینک والے بابو سیتا رام کی آواز بلند ہوتی۔ "پنڈت جی! پانی بہت گرم ہے، دو پیسے کی برف تو منگواؤ"۔ اور رامو دو پیسے کی برف لینے چلا جاتا۔ لوٹنے پر پنڈت کی گالیاں بے تابی سے اُس کا انتظار کرتیں۔ وہ چاہے کتنی بھی جلدی کیوں نہ لوٹ آئے، پنڈت گالی دیے بغیر نہ رہ سکتا۔ گالیاں اُس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھیں۔ سانس لیتے وقت بھی وہ گالیاں نہ چھوڑتا، جیسے ایسا نہ کرنے سے دنیا میں قحط پڑ جانے کا خدشہ تھا۔

پنڈت کے ہوٹل سے ملا ہوا ایک مکان تھا جو اُس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ کالج کے لڑکے جو ہاسٹل کے اخراجات برداشت نہ کر سکتے، اور دفتروں اور بینکوں کے کم تنخواہ والے ملازمین، وہاں قیام کرتے۔ ایک ایک کمرے میں چار یا پانچ بابو پڑے رہتے ـ اونچے درجے والوں کے سلوک سے چڑے ہوئے، یہ لوگ اپنا غصّہ ہوٹل کے غریب اور بے بس نوکروں ہی پر نکالتے۔ اس لذّت کا احساس کہ رُعب جمانے اور احساسِ برتری دکھانے کے لئے سماج میں ان سے بھی نیچے درجے کے

لوگ موجود ہیں، اُنھیں پاگل بنائے رکھتا۔ اپنی معمولی حیثیت کی پروا نہ کرتے ہوئے،
وہ ہوٹل میں شان سے رہنا چاہتے۔ اس شان کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کھانا
کمرے میں منگواتے۔ اس کام کے لئے رآمو ہی تعینات تھا۔ اُس کے فرائض میں ضرور
اضافہ ہوجاتا، لیکن اُسے اس کا معاوضہ کبھی نہ ملتا۔ گرمیوں میں اُس کی شامت
آجاتی۔ دوپہر کے وقت، ننگے سر ننگے پاؤں، دونوں ہاتھوں سے گرم تھالی سنبھالے
وہ بابو لوگوں کے کمروں میں جاتا، وہاں اُسے پانی لانے کا حکم ہوتا، پھر برف لانے کا۔
جب روٹی ختم ہوجاتی تو روٹی کے لئے اور جب دال ختم ہوجاتی تو دال لانے کے لئے
دوڑنا پڑتا۔ اس پر بھی بابو لوگ خوش نہ رہتے۔ وہ اکیلا تھا اور کھانے والے کئی۔
سب کو خوش رکھنا ناممکن تھا اور گالیاں سُننا اور جھڑکیاں کھانا ناگزیر تھا
اور کوئی بابو اپنے غصّے پر قابو نہ پاکر ایک آدھ چپت بھی رسید کر دیتا۔ وہ کچھ نہ کہتا۔
لیکن پنڈت پھر بھی ناراض رہتا۔ کمروں میں اتنی دیر لگانے کا کیا مطلب؟ ہوٹل پر بھی
تو گاہکوں کو بھگتنا تھا۔ کیا یہ کام تیرا باپ کرتا؟ کیا کمرے والے بابو روٹی کے زیادہ
پیسے ادا کرتے ہیں؟ پنڈت اُن کو تو کچھ نہ کہہ سکتا، لیکن سارا غصّہ رآمو پر نکالتا۔
وہ پھر بھی خاموش رہتا۔

پنڈت کو اس بات کی خاص شکایت رہتی کہ وہ دوسرے کاموں میں بھینس کو
بھول جاتا۔ جب وہ جانتا تھا کہ یہ ایک دن کا نہیں بلکہ روز کا کام ہے تو اس میں
کوتاہی کیوں کرتا تھا؟ اگر وہ اس کام میں غفلت دکھائے تو وہ دودھ کیا خاک دیگی؟
اور دودھ کے خریداروں کو کتنا مایوس ہونا پڑے گا۔ گاہک کو روٹی ملنے میں دیر ہوجائے
یا ہوٹل کا ذرا سا ہرج ہو، تو وہ برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن بھینس کی خدمت میں غفلت ہو

وہ ہرگز اسے برداشت نہ کرسکتا تھا۔اس معاملے میں وہ اُسے کبھی بھی معاف نہ کرسکتا تھا اور عموماً اپنے غصّے کو مکّین کے ذریعہ ہی سے نکالتا۔ اب اُسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ پنڈت کا کام اُسے پیٹنا ہے اور اُس کا کام چپکے سے مار کھانا اور تنخواہ اور روٹی کے عوض پنڈت کو اس کے جسم پر پورا حق حاصل ہے۔ وہ شاید اس فیصلے کو منظور کرنے سے انکار کر دیتا، لیکن اسے اپنے وعدہ کا پاس تھا۔ شوبھا کی آنکھوں سے نکلے ہوئے بڑے بڑے آنسو ہمیشہ اُس کے سامنے تیرتے رہتے۔

اُس کی اِن خدمات کے عوض، اسے ہوٹل سے دونوں وقت پکا پکایا کھانا ملتا۔ جب سب گاہک کھا چکتے تو اس کی باری آتی۔ موٹی موٹی خشک روٹیوں کے ساتھ، بچی کھچی دال سبزی سے اُسے پیٹ بھرنا ہوتا۔ بعض اوقات کچھ بابو دیر سے آتے اور کھانا مانگتے تو پنڈت بچی کھچی دال سبزی بھی اُنھیں کی نذر کر دیتا، اس لیے رامو کو کبھی کبھی بغیر ترکاری کے خشک ٹکڑے چبانے پڑتے۔ وہ اچار نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اچار تو بازار سے مول آتا تھا اور صرف بابو لوگوں کے استعمال کے لئے مخصوص تھا۔

اُسے ملازم ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے، اُس نے حساب لگایا، پنڈت کے پاس اس کے ایک سو چالیس روپے جمع ہو چکے تھے۔ اِس اثنا میں اُس نے صرف دس روپے لئے تھے۔ جن سے اُس نے اپنی شوبھا کے لئے تحائف خریدے تھے۔ جب کبھی وہ بازار جاتا اور چوڑیوں پر اُس کی نظر پڑتی تو اگلے دن وہ پنڈت سے پیسے مانگ کر ان چیزوں کو خرید لاتا۔ یہ اُس کے اپنے پیسے تھے، لیکن پھر بھی وہ سخت ہچکچاہٹ کے ساتھ اُن پیسوں کو مانگتا۔ پنڈت بھی

پیسے دیتے وقت بہت لیت و لعل کرتا۔ وہ ان چیزوں کو سنبھال کر لکڑی کے ایک چھوٹے بکس میں رکھ لیتا۔ یہ بکس اور ایک چھوٹا سا تالا اُس نے سستی قیمت پر بازار سے خریدا تھا۔ کام کے دوران میں وہ کئی بار کمرے میں جاکر دیکھتا کہ صندوقچی کو کسی نے اُٹھا نہ لیا ہو یا کسی نے اُس کا تالا نہ کھول لیا ہو۔ اسے بچھمن پر شک رہتا، کیونکہ پنڈت کے تمام نوکروں میں وہ اس سے بَیر رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کئی بار بچھمن کی مرمت کرنے کے منصوبے باندھے تھے۔ وہ صرف اُس کی آنکھوں میں غضب آلود نگاہیں ڈال کر خاموش رہ جاتا جیسے اُسے جتلا رہا ہو کہ ایک دن اس کی آنکھوں کے شعلے اس کے ہاتھوں میں اُتر کر اُس کے گالوں کو ضرور سرخ کر دیں گے۔

ایک دن اپنے گاؤں کے ساتھی رانو کو پنڈت کی دوکان پر کھڑا دیکھ کے وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکا۔ وہ بھاگ کر اُس کے پاس آیا، دل میں ہزاروں سوال اور لاکھوں تمنائیں لئے۔ لیکن پنڈت کی گندی گالی اور کرخت جھڑکی نے اُس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔

"کیا تمہیں خبر نہیں کہ بازار سے بھینس کے لئے ابھی پونے لانے ہیں؟" وہ گرج کر بولا۔ آج اُسے پہلی بار پنڈت پر غصہ آیا۔ اُس کے دل میں اُبال اُٹھا۔ وہ اُسے صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ رانو سے ملنے کے بعد بازار جائے گا۔ لیکن الفاظ زبان پر آکر رک گئے۔ پنڈت کی گرج اُس کے کانوں میں پھر گونجی۔ "سُور کا بچہ، کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟" وہ چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ آج اُسے پہلی بار اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور پہلی بار اُس کے دل میں پنڈت کے خلاف احتجاج کا جذبہ بلند ہوا۔ کیا اُسے رانو سے ملنے کا بھی کوئی حق نہ تھا؟ نہ جانے وہ گاؤں سے کیا کیا

خبریں لایا تھا، اُس کے اپنے گھر کی، گاؤں کی اور شوبھا کی خبریں، کتنی بے تابی سے وہ اُس کا انتظار کرتی ہوگی! روزمرّہ اُس کی راہ تکتی ہوگی ـــــــ اچانک اُسے دھکّا لگا۔ ہیٹ اور سوٹ پہنے ایک بابو اُسے گالیاں دے رہا تھا " شور، اندھا ہوگیا ہے؟ دیکھ کر نہیں چلتا؟" وہ سنبھل کر چلنے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ اُسکو بھینس کے لئے بنولے لانا ہیں۔ کاش وہ بنولوں کی جگہ زہر لے آتا، آدھا بھینس کو اور آدھا پنڈت کو کھلا دیتا۔ جب زہر کھا کر پنڈت تڑپتا تو وہ اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر اُس کے گالوں پر گھونسوں کی بارش برساتا۔ مکّوں کی شدّت کی چوٹ سے اُس کے مُنھ سے خون کا فوّارہ چھوٹ نکلتا۔ وفورِ مسرّت سے وہ ناچنے لگتا اور چلّا کر کہتا۔

"اے دنیا والو! آج میں کتنا خوش ہوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ سچی راحت حاصل کرنے کے لئے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنا ازحد ضروری ہے۔ اگر سُکھ چاہتے ہو تو بدلہ لینے سے مت چوکو۔ اپنے دشمنوں کے خون کے فوّارے چھڑا دو۔ اگر پھر بھی کسر رہے تو اس کے کچھ گھونٹ حلق کے نیچے اُتار لو۔ ایسا کرنے سے تمھیں اسی دنیا میں جنّت کے مزے نصیب ہوں گے۔"

جب وہ ہوٹل لوٹا تو راَنو سبزی کاٹ رہا تھا۔ پنڈت کے پاس ایک نیا شکار پھنسا تھا۔ اُسکی راَنو سے بات کرنے کی ہمّت نہ ہوئی، کیونکہ پنڈت پاس بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا۔ کاش وہ پنڈت سے حقّہ چھین کر چلم کی آگ سے اُسکی مونچھیں اور سر کے لمبے لمبے بال جھلس دیتا۔

وہ شوبھا کی خبر سننے کے لئے بے قرار تھا ـــــــ رات کو راَنو سے پتہ چلا کہ اُس کا بڈھا دادا مر گیا تھا، ایک گائے بھی چل بسی تھی۔ اُس کی ماں ہر وقت اُس کی

یاد کرتی اور دوسری عورتوں سے بات کرتے وقت آنسوؤں کی جھڑی لگا دیتی۔ نندو کی شادی ہو چکی تھی۔ شوبھا ابھی زندہ تھی۔ اس کے آنے کے چار ماہ تک وہ خوش وخرم رہی۔ لیکن اس کے بعد کسی نے گاؤں میں خبر اڑا دی کہ رآمو ندی میں چھلانگ لگا کر مر گیا ہے۔ اس خبر نے اس کے دل کو ہلا دیا اور وہ مغموم رہنے لگی۔ اس کے والدین نے اس کی شادی رچا دینے کا فیصلہ کر لیا، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جب بات طول پکڑنے لگی تو اس نے چھ مہینے کی مہلت مانگی۔ اس کا باپ تو بضد تھا لیکن ماں اور دادی نے اس کو سمجھا کر چھ ماہ انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اسکی حالت اب دگرگوں رہتی ہے۔ اگر ایسا ہی رہا تو اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔

اس خبر نے اسے تشویش کی گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ غم کا پہاڑ اس کے سر پر گر پڑا۔ رآنو نے اور بھی بہت کچھ کہا، لیکن اس کا دھیان صرف ایک ہی بات پر مرکوز تھا۔ شوبھا کی بیماری کی خبر نے اسے ادھ موا سا کر دیا، لیکن وہ اس خیال سے خوش بھی تھا کہ شوبھا اس سے محبت کرتی ہے۔ اسے اپنے اوپر فخر محسوس ہونے لگا۔ وہ خوش تھا کہ شوبھا صرف اسی کی ہے۔ اس کے دل پر صرف اسی کا قبضہ ہے۔ نندو اس کے راستہ میں حائل تھا لیکن اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اب میدان بالکل صاف تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ اس نے پیسے بھی کما لئے تھے۔ اس نے سوچا اگلے دن وہ پنڈت سے پیسے لے گا۔ بازار سے ایک خوبصورت بُندوں کی جوڑی اور ایک نفیس ریشمی ساڑی خریدے گا اور ان کے ساتھ دوسرے تحائف لے کر وہ سیدھا گاؤں کو روانہ ہو جائے گا۔ سب سے پہلے وہ شوبھا سے ملے گا اُسے دیکھ کر شوبھا کو اپنی آنکھوں پر ہرگز یقین نہ آئے گا۔ اچانک اُسے دیکھ کر وہ بھکتے میں

رہ جائے گی۔ وہ اُسے چشمے کے کنارے لے جائے گا۔ سب سے پہلے وہ ریشمی رومال اُس کی نذر کرے گا۔ پھر صندوقچے سے ساڑی اور بندوں کی جوڑی نکال کر اُس کو دیگا۔
______ وہ فرطِ مسرت سے اچھل پڑے گی۔ دوسرے تحایف کو دیکھ کر وہ خوشی سے متوالی ہو جائے گی۔ اُس کے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ جائے گی۔ اور وہ دفورِ جوش سے کہہ اُٹھے گی، "رامو تم کتنے اچھے ہو"۔ صرف اسی فقرے کو سُننے کے لئے اس نے گھربار چھوڑ کر مصائب سہہ کر شہر میں رہنا منظور کیا تھا۔ ان الفاظ کی گونج اس کے دل کا ایک ایک تار ہلادے گی۔ اس کی رگ رگ میں ایک مدھر گیت کی الاپ گونج اُٹھے گی، اُس کا انگ انگ ایک سُریلے سُر سے بھر جائے گا ______ گردونواح کے پہاڑوں میں بھی صرف ایک ہی نغمے کی گونج سُنائی دے گی۔ چشمے کے پاس اور مرغزار کے بیچ وہ شنو تھا کے قدموں پر سر رکھے لیٹا ہوگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُس کی ناگن سی کالی زلفوں سے چھیڑ کر رہے ہونگے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے اُن لانبے لانبے بالوں کو اُس کے منہ پر سے ہٹا رہا ہوگا۔ کاش وہ اُڑ کر چشمے کے کنارے پہنچ جائے، لیکن ابھی اُس کو پنڈت سے پیسے لینے تھے۔

اگلے دن سویرے اُسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پنڈت کو بہت تعجب ہوا۔ وہ بیداری کے بعد چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے لحاف ابھی تک اوڑھ رکھا تھا۔ پلنگ کی میلی چادر میں بل پڑنے کی وجہ سے نیچے کی گندی چوہی نظر آرہی تھی۔ قریب ہی دوسری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہو۔ ایک کونے میں لکڑی کا ایک صندوق پڑا تھا جس میں ایک بڑا تالا لٹک رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک قدِ آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔

ایک طرف کرشن جی کی تصویر تھی، جس پر جالا لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک کیلنڈر تھا جس میں فلمی ایکٹرس کی تصاویر تھیں۔ دائیں دیوار پر لیڈروں کی تصاویر والا ایک کیلنڈر آویزاں تھا۔ بائیں طرف دیوار پر ایک خنجر لٹک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پنڈت کی بھنویں تن گئیں اور گرج کر بولا:۔

"کیوں بے سور، صبح صبح کیوں آمرا ہے؟"

آج پنڈت کی آواز سن کر اس کے دل میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی، اور نہ اُس نے نیچی نگاہیں کر کے زمین کریدنے کی کوشش کی۔ اُس نے گردن کو اونچا کر کے کہا

"میں گھر جا رہا ہوں۔"

"کیا کوئی مر گیا ہے؟" پنڈت نے سینہ تان کر کہا۔

"کیا لوگ صرف اِسی وجہ سے گھر جاتے ہیں؟"

"کیا بکتا ہے؟ جا۔ اپنا کام کر۔" پنڈت نے خشم آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کام کرنے ہی آیا ہوں۔" اس نے توازن قائم رکھتے ہوئے کہا۔ "میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا حساب کر دیجئے۔"

پنڈت کے گویا بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اسے یہ سوال بالکل غیر قدرتی معلوم ہوا اس نے لحاف کو ایک طرف پھینک دیا اور آنکھوں سے چنگاریاں برساتے ہوئے بولا

"سور کے بچے! یہ کوئی حساب کا وقت ہے؟"

نہ جانے کتنی بار اُس نے اس گالی کو سُنا اور ہضم کیا تھا۔ آج بھی ہضم کرتے

دیر نہ لگی۔ بولا۔ "اور کس وقت آؤں؟"

"میں اس ماہ حساب نہیں کرسکتا۔ اگلے مہینے دیکھا جائے گا؟"

اس جواب نے اُسے خوفزدہ کردیا۔ ایک ماہ تو کیا وہ ایک دن بھی انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اُڑکر اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ایک مہینہ اُس کے لئے ایک جُگ کے برابر تھا۔ اگر سچ مچ پنڈت اپنی بات پر اڑ گیا؟ اس خیال نے اُسے لرزاں کردیا۔ وہ اُس کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ اس نے ہزار منّتیں کرڈالیں۔ لیکن پنڈت نے ہر منّت کا جواب گالی سے دیتا۔ تب وہ گالیاں دے کر بھی تھک گیا۔ تو تنگ آکر بولا "وقت ضائع نہ کر، جاکر اپنا کام کر۔ میں نے ابھی اشنان بھی نہیں کیا" ——— اب رامو کا عاجزانہ انداز بدل گیا۔ اُس کا انکسار ایک دم غائب ہوگیا۔ اور وہ تن کر بولا "لیکن پیسے میرے اپنے ہیں۔ یہ میری محنت اور دھرم کی کمائی ہے۔ میں اسے لے کر ہی رہوں گا۔"

پنڈت پر جیسے گرم لوہے کی چوٹ پڑی، وہ تڑپ اُٹھا۔ ہونٹ بھینچ کر، مکّہ تان کر، بھوکے بھیڑیے کی طرح وہ شکار پر پل پڑا۔ اُس کے مکّوں کی بارش نے رامو کو بے دم کردیا۔ اچانک خون کی ایک بوند زمین پر ٹپکی اور رامو کی نظر سامنے والے شیشے پر پڑی۔ خون سے لت پت چہرے پر سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اُس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں کے اُوپر ایک زخم ہوگیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا ——— کیا وہ اس گندی شکل کو لے کر شوبھا کے پاس جائے گا؟ اُس کی چھ ماہ کی محنت ضائع جارہی تھی۔ اگر وقت گزر گیا اور اسے دیر ہوگئی تو شوبھا کسی اور سے شادی کرلے گی۔ اُس کی اُمیدیں دم توڑ رہی تھیں۔ اُس کے نخلِ آرزو کو ایک تند آندھی جڑ سے ہلا رہی تھی۔ اگر وہ اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے چوک گیا

تو امید کی آخری شعاع بھی بجھ جائے گی۔ پنڈت اب بھی غصہ سے کانپ رہا تھا۔ شاید وہ اسے مار ڈالنے ہی پر تُلا ہوا تھا۔ نہ جانے رآمو کو کیا سوجھی، اُس نے جھٹ اُٹھ کر کواڑ اندر سے بند کر لئے۔

اس کے بعد کمرے سے چیخیں بلند ہوئیں۔ گھر کے لوگ، محلّے کے آدمی اور ہوٹل کے سب نوکر باہر آموجود ہوئے۔ دروازوں پر مُکّوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اچانک دیواروں کو پھاڑتی ہوئی، دلوں کو چیرتی ہوئی، ایک پُر درد چیخ، کمرے سے باہر نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ ساتھ ہی دروازہ بھی کھُل گیا۔

کمرے کے فرش پر پنڈت کا جسم خون سے تر پڑا تھا، گردن اور چھاتی سے خون بہہ رہا تھا۔ پاس ہی لہو میں بھرا خنجر پڑا تھا اور نیچی نگاہ کئے رامو کسی گہری سوچ میں مستغرق کھڑا تھا۔

کتنا اونچا کتنا نیچا

سامنے برف سے ڈھکی ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں ہیں۔ صبح کو سورج کی ننھی کرنیں، برف سے ہم آغوش ہو کر، اُسے پیار سے چومتی ہیں، تو برف کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ قدرت فرطِ مسرت سے ناچ اُٹھی ہے۔ دن بھر کی مسافت کے بعد جب سورج شام کو پہاڑ کے پیچھے آرام کرنے جاتا ہے تو اُس کی سنہری کرنیں برفانی چوٹیوں سے لپٹ جاتی ہیں۔ برف کا حسین چہرہ سُرخی مائل ہو اُٹھتا ہے۔ سفیدی اور سُرخی کا یہ ملاپ کتنا دلآویز ہوتا ہے۔ اُسی وقت قدرت ایک عجیب منظر پیش کرتی ہے۔ دیار اور بن کے اونچے درختوں سے بھرا ہوا جنگل ایک دم ساکن ہو جاتا ہے۔ یہ پیڑ جنھیں سورج کی تمازت زندگی عطا کرتی ہے اور جس زندگی کو حاصل کر کے وہ طوفانِ باد و باراں، کا ہنس کر مقابلہ کرتے ہیں، اپنے محسن کی رخصت کے وقت اُسے سلامی ادا کرتے ہیں۔ وہ بالکل خاموش کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ساری کائنات کی زبان پر مہرِ خاموشی لگ جاتی ہے۔ چرند اور پرند بھی چُپ ہو جاتے ہیں۔ اپنے محبوب کے جانے کا سب ماتم کرتے ہیں، لیکن جب صبح کے وقت سورج کی آمد ہوتی ہے

وہی اشجار خوشی سے جھومتے ہیں۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ اور سارا جنگل مسرت سے ناچ اُٹھتا ہے۔

ان برفانی چوٹیوں کے بائیں طرف والے پہاڑ ایک دم ننگے سے کھڑے ہیں جیسے قوی ہیکل دیو ہوں۔ بائیں طرف کو وُہ قد و قامت میں کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور گھٹتے گھٹتے میدان سے جا ملتے ہیں۔ ایک طرف وُہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہیں اور دوسری طرف زمین کی پستیوں سے جا ملتے ہیں۔

بنگلے کے لان میں بیٹھ کر میں چار سڑکوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ نیچے پٹھان کوٹ سے آنے والی سڑک ہے۔ جب بس اس ٹکڑے پر اُوپر آتی ہوئی نظر پڑتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ اُس کی درد بھری پکار بھی سُنائی دیتی ہے۔ چار گھنٹے تک وُہ زمین سے آسمان کی طرف بھاگتی، سطح سمندر سے ۶ ہزار فٹ اوپر آ پہنچتی ہے۔ اس سخت چڑھائی میں اُس کا دم پھول جاتا ہے۔ اور انجن سے ایک پکار نکلتی سُنائی دیتی ہے۔ یہ پٹھان کوٹ سے گرمی کے مارے مسافروں کو لئے آ رہی ہے۔ اکثر لوگ دور میدانوں کے باسی ہیں جن میں سے کم تر صاحب مال اور بیشتر صاحب دل ہوتے ہیں۔ پہاڑ پر آنے کے لئے محض پیسے سے کام نہیں چلتا کیونکہ ہر پیسے والا اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے مناظر کا لُطف اُٹھانے کے لئے بےچین اور ہر لمحہ تڑپنے والے دل کی بھی ضرورت ہے۔

بس ایجنسی پر آ کر رکتی ہے تو قلی لوگ اُس پر بُری طرح سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ڈرائیور یا کنڈکٹر یا پسنجر سے پوچھے بغیر وہ موٹر کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور جو سامان جس کے ہاتھ لگتا ہے اُسے نیچے اُتار لیتا ہے۔ جب تک وُہ سامان کو گھر

نہ پہنچا دے وہی اُس کا مالک بنتا ہے۔
وہ دیکھئے سواریاں بس سے اُتر کر سڑک سے اوپر آرہی ہیں۔بائیں طرف کی سڑک صدر بازار کو جاتی ہے اور دائیں طرف کی پوسٹ آفس کو۔ آپ دونوں سڑکوں پر آتے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ سے ملئے۔ آپ ہیں لالہ سائیں داس مل اونر آپ پچھلے چار سال سے لگاتار یہاں آتے ہیں۔آپ نے پیسے کمانے کی مشین اتنی تیزی سے چلائی کہ آپ کے پیٹ کی مشین مدھم پڑگئی۔ سخت بیماری میں پانی کی طرح پیسہ برباد کرنے کے بعد بھی جب آپ اچھے نہ ہوئے تو ڈاکٹروں نے آپ کو یہاں آنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے ڈلہوزی والوں کے حال پر کرم فرمائی کی اور یہاں تشریف لے آئے۔ لالہ سائیں داس جی اُن ممتاز ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے دھن کمانے میں اپنا من اور دوسروں کا تن صرف کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ پیسے کو سنبھال کر رکھنے کے لئے آپ نے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا۔ جہاں ایک طرف آپ نے ملازمین کو کم تنخواہ پر رکھنے کی کوشش کی، وہاں انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔انہوں نے اس گُر کو حفظ کر رکھا تھا کہ اگر ہزار بچانے کے لئے سو خرچ کرنے پڑیں تو ضرور خرچ کر ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے اگر سینکڑوں خرچ کئے تو ہزاروں بچائے اور اگر نہ بچاتے تو کس طرح امرتسر جیسے بڑے شہر میں دو عالیشان بنگلے بنا سکتے؟ پیسوں کے بغیر اپنے دونوں لڑکوں کو امریکہ کیسے بھیج سکتے اور فرسٹ کلاس کار کیسے رکھ سکتے؟
اور وہ کون صاحب آرہے ہیں؟ شری کاردنفتی رام جی مشہور و معروف

نیتا ،صوبے کے مشہور سیٹھ بنواری لال کے فرزند ارجمند سیٹھ بنواری لال کے اسم گرامی سے
کون واقف نہیں ؟ آپ ہی وہ ممتاز ہستی ہیں جو کچھ سال پہلے ایک معمولی منیم سے
نگر سیٹھ بن گئے ۔ جنگ کے دوران میں آپ نے بلیک کو اپنا کر دونوں ہاتھ اس طرح
چلائے کہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کا روپیہ اُن کی جیبوں سے نکل کر آپ کے پاس آگیا ۔
ایک عالی شان دماغ کے ساتھ آپ نے ایک فیاض دل بھی پایا ہے ۔ اسکا ثبوت وار فنڈ
میں انگریز کی دل کھول کر مدد کی ۔ انگریز کے چلے جانے اور نیا آئین بننے کے بعد آپ کے
قومی جذبے نے جوش کھایا تو اپنے فرزند رونقی رام کو دیش سیوا کرنے کی غرض سے اسمبلی
کے لئے کھڑا کر دیا ۔ رونقی رام جی اَن پڑھ نہیں ۔ بی اے ، ایل ایل بی ہیں ۔ کون جانے
کس وقت صوبے کے محکمہ منتری بن جائیں ۔ چناؤ سے پہلے رونقی رام نے ہر پارٹی سے ٹکٹ
کی درخواست کی اور وہ مسترد ہونے پر انہوں نے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑا
اور اُن کے پیسے نے حریف کے چھکے چھڑا دیے ۔ آج کل وہ آزاد نہیں رہے کانگریس میں شامل
ہو گئے ہیں ۔ اور ہر ملنے والے کو گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے اور شدھ کھادی پہننے کی تلقین
کرتے ہیں ۔ ابھی حال ہی میں اُن کا چھوٹا لڑکا ساتویں میں فیل ہو گیا تو بنواری لال اور
ان کے فرزند ارجمند نے سکول کے ہیڈ ماسٹر کو اس کے گھر جا کر خوب پیٹا ۔ پچھلے دنوں
اپنی لڑکی کی شادی کے جہیز میں آپ نے پانچ ہزار روپے کی محض ریشمی ساڑھیاں دیں ۔
سیٹھ جی خود ہندو مہاسبھا کے ممبر ہیں اور رونقی رام کے چھوٹے بھائی دولت رام کمیونسٹ
پارٹی کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں ۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی سوشلسٹ پارٹی کے
سرگرم کارکن ہیں ۔ ایک دو دن یہاں رہنے کے بعد رونقی رام جی گھوڑے پر بیٹھ کر
چھبہ جائیں گے ، جہاں آپ اپنے کر کملوں دوارا ایک سبزی کی دوکان کا اُدگھاٹن کرینگے ۔

اخباروں میں بھاشن چھپوانے کے لئے خاطر خواہ انتظام کر لیا ہے۔ آپ کی اتنی عنایت ہی کیا کم ہے کہ آپ دو دن کے لئے اس دور افتادہ شہر کی رونق کو دوبالا تو کر دیتے گئے؟

ادھر صدر کو جانے والی سڑک پر ایک گورا اپنی پیٹھ پر بستر لادے جا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی اور بچہ ہے، وہ امریکن مشنری مسٹر ٹانگر ہے۔ وہ خاکی سلک کی بش شرٹ اور کھلے ہوئے پائنچے والی پتلون پہنے ہے۔ ہزاروں میل سے وہ ایک ترقی یافتہ ملک اور قدیم مذہب کا پیغام لے کر اس پچھڑے ہوئے ملک کی بھلائی کے جذبے سے متاثر ہو کر آیا ہے۔ وہ یہاں کے پہاڑی لوگوں کو پیغمبر امن حضرت یسوع مسیح کا پیغام سنانے اور اُنھیں مسیح کی بھیڑوں میں شامل کرنے آیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ، عیسائی بن جاؤ، پھر کسی بات کی فکر نہیں۔ مسٹر ٹانگر تبدیلئ مذہب کے ساتھ ساتھ، تبدیلئ سیاست پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو پنڈت نہرو کی دیش بھگتی کے خلاف، امریکن گٹ میں شامل ہونے کی بھی تلقین کرتے ہیں اور اُنھیں کی طرح کے پانچ ہزار امریکن مشنری، ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیل کر پیغمبر امن حضرت آئزن ہاور، پیغمبر جمہوریت حضرت فاسٹر ڈلس اور پیغمبر انسانیت حضرت میکارتھی کی تعلیم کو پھیلا رہے ہیں۔

اور وہ دیکھئے پیٹھ پر ٹرنک اور بستر رکھے قلی لوگ چلے آ رہے ہیں۔ اکثر ننگے پاؤں یا پھٹے ہوئے جوتے پہنے ہیں۔ انھوں نے پاجامے اور قمیص پہننے کی رسم ضرور پوری کی ہے، لیکن اگر قمیص کندھوں سے پھٹی ہے تو پاجامے گھٹنوں سے جواب دے گئے ہیں۔ وہ اپنے پاس رسّے رکھتے ہیں جن کی مدد سے سامان کو آسانی سے باندھ کر پیٹھ پر لاد لیتے ہیں۔ منوں بوجھ پیٹھ پر لادے وہ پہاڑ کی سخت

چڑھائی پر چڑھ جاتے ہیں جیسے کچھ بات ہی نہ ہو۔ ایجنسی سے اوپر ایک ہزار، دو ہزار، تین ہزار فٹ کی بلندی پر وہ اسی طرح لدے لدائے چلے جاتے ہیں جیسے آدمی نہیں جانور ہوں۔ آدمی بننے کا انھیں آج تک خیال نہیں آیا۔ کیونکہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے وہ قسمت پر شاکر ہیں۔ اگر پچھلے جنم میں انھوں نے اچھے کرم کئے ہوتے تو بابو، صاحب، چوہدری یا زمیندار ہوتے۔ انہوں نے پشتوؤں سے کام کئے تھے۔ اور پشتوؤں کا کام کر رہے ہیں۔ اور نہ جانے کتنی پشتوں سے۔ قدرت نے بھی پہلے ہی سے ایسا سلسلہ قائم کر دیا ہے کہ قلی کے گھر قلی ہی جنم لے۔ سب پاپ کرنے والے ایک ہی جگہ اکٹھے کر دئے جاتے ہیں۔ حکومتیں آتی ہیں، اور چلی جاتی ہیں۔ لیکن ہر حکومت کو قائم رہنے کے لئے اس حد تک کوشاں رہنا پڑتا ہے کہ قلیوں جیسے نکمے لوگوں کی زندگی کو سدھارنے کے سے فضول کاموں کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ اور پھر دھیان دینے کا فائدہ ہی کیا؟ حاکم لوگ لوگ بھی تو اکثر ہندوستانی ہیں، مسلۂ کرم کے معتقد۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے اچھے کرم کئے ہوتے تو اچھے گھرانوں میں پیدا ہوتے۔ ہندوؤں کے بعد ترک آئے پھر پٹھان، ان کے بعد مغل پھر انگریز۔ ان سب حکومتوں کے زمانے میں قلی، قلی ہی رہے۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہماری اپنی حکومت آئی، لیکن قلی آج بھی قلی ہے اور بھلا اب کیا وہ انسان یا صاحب بنے گا؟ پھر حکومت اگر قلیوں ہی کی دیکھ بھال میں لگ جائے تو باقی کام کون کرے؟

بنگلے کے بائیں جانب، کوئی پچاس فٹ اوپر، ٹھنڈی سڑک دکھائی دیتی ہے۔ یہ ڈلہوزی کی سب سے پُر رونق جگہ پوسٹ آفس سے شروع ہو کر، چکر کاٹتی اور دائرہ سا بناتی جاتی ہے۔ چیرنگ کراس پہنچکر وہ گرم سڑک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پوسٹ آفس

آکر ختم ہو جاتی ہے۔ پوسٹ آفس ہی ڈلہوزی کی چوپاٹی یا سکینڈل پوائنٹ ہے۔ شام کے وقت یہاں نمائش لگتی ہے، سُرخی اور پاؤڈر کی - بھڑکیلے سوٹوں اور خوبصورت ساڑھیوں کی، بہت سے لوگ اپنی نمائش کرنے اور بہت سے نمائش دیکھنے وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

اگر دیکھنے والے نہ ہوں تو نمائش کی قدر ہی کون کرے؟ ایک زمانہ تھا جب شام کے وقت اس جگہ خوب بھیڑ ہوتی تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ جوانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ حسین دوشیزائیں اپنی اُبھرتی جوانیوں سے نوجوانوں کو بدمست اور اپنے تیکھے نینوں کے بان سے اُن کے دلوں کو چھیدتی تھیں - نوجوان عورتیں ایک ہی رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور اُسی رنگ کا دوپٹہ گلے میں ڈالے، جنّت کے پھولوں کی طرح اپنی شگفتگی سے دماغوں کو معطّر کرتی تھیں - کالجوں کے البیلے نوجوان، قیمتی اور فیشن دار گرم سوٹ، خوبصورت اور نئی وضع کے سویٹر پہنے بازارِ حسن میں بدمست نینوں کے بان کھانے کو پریشان و بدحال پھرتے - آج زمانہ بدل گیا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا، انگریز چلا گیا، لیکن کمبخت چلتے وقت اپنے ساتھ ڈلہوزی کی رونق بھی لے گیا۔ یہاں کی زندگی کو بے رس اور بے رنگ و بو کر گیا۔ شام کو لوگ اب بھی اکٹھے ہوتے ہیں، لیکن اب حسن و جوانی کا سمندر لہریں نہیں مارتا، فیشن کا بازار نہیں سجتا اور البیلے بانکے نوجوان نظر نہیں آتے۔ جس جگہ ایک چھوٹی سی دوکان ملنی قطعاً دشوار تھی، وہاں اب بڑی بڑی دوکانیں خالی پڑی ہیں۔ جہاں سوٹ بوٹ میں ملبوس دوکاندار ہم جیسے خستہ حالوں کو اپنی دوکان کے نزدیک آتے دیکھ کر ناک بھوں سکیڑ لیتے تھے، اب ہمیں دیکھ کر، اپنے دونوں بازو پھیلا کر ہمارا

اس طرح سواگت کرتے ہیں، جیسے ہم اُن کے بہت عزیز مہمان ہوں - انقلابات ہیں زمانے کے -

اب اس قدرتی جمال کے بیچ، انسانی حُسن دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس جاتی ہیں - لیکن وہ سامنے سڑک پر ہلکا گلابی رنگ کا سوٹ نظر آ رہا ہے - چہرے پر بھی ویسی ہی سُرخی ہے - بوٹا سا قد، لمبے لمبے گیسو، قیامت خیز جوانی - اس دوشیزہ کے پیچھے ایک دس سالہ لڑکا، غلیظ کپڑوں میں ملبوس چلا جا رہا ہے - وہ بھیگی بلّی کی طرح سہما ہوا ہے - اُس کے سر پر مارکیٹ سے خریدی ہوئی چیزوں سے بھرا ہوا ٹوکرا ہے - دوشیزہ یہاں سے ڈیڑھ میل دوری پر اور نو ہزار فٹ بلندی پر واقع اوپر بکروٹے پر بنگلہ میں رہتی ہے - مارکیٹنگ کے ساتھ ساتھ اُس نے سیر بھی کر لی اور نمائش بھی دکھا دی - اپنے بنگلہ میں جا کر وہ اس پہاڑی لڑکے کے ہاتھ پر پورے دو آنے رکھ دے گی اور اس عالم میں شاعر پکار اُٹھے گا -

کہہ دو تصوّراتِ محبّت حرام ہیں

دوشیزہ چلی گئی اور اُس کے پیچھے رائے صاحب تیج رام نظر آئے - گرم پاجامہ، بند گلے کا اونی کوٹ، سر پر اُلٹی ریشمی پگڑی، ہاتھ میں چھڑی اور آنکھ میں سُرمہ لگائے وہ سیر کر رہے ہیں - آپ یہاں کے رئیس اور جاگیردار ہیں، مہاجن اور ساہوکار ہیں - ایک وقت آپ آنریری مجسٹریٹ تھے، نہ صرف یہاں بلکہ اِدھر گرد علاقوں میں بھی آپ کا طوطی بولتا تھا - اتنا اثر و رسوخ اور اتنا رعب و داب تھا کہ جنگل سے گایوں اور بھینسوں، گھوڑوں اور بیلوں کے لئے گھاس اور جلانے کے لئے ایندھن مفت ہی مل جاتا تھا - فرنیچر بنانے کے لئے لکڑی کوڑیوں کے دام میسّر ہو جاتی تھی

نوکر چاکر بیگار میں مل جاتے تھے، راج مزدور آپ کی خدمت کے لئے بیتاب رہتے تھے۔
قدرت کی اتنی عنایات اور اپنی ذہانت کے سبب آپ نے یہاں اور ارد گرد کے علاقوں
میں کوٹھیاں اور بنگلے، دکانیں اور مکان بنائے اور ان کے کرائے سے خوب مایا جوڑی۔
اپنے لڑکوں کو انگلینڈ بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلوائی اور انگریزوں کے پاؤں پر اپنی ریشمی پگڑی رکھ کر
انہیں بڑے بڑے عہدے دلوائے۔ کسانوں کو سود پر روپیہ دیا اور جب وہ واپس نہ لوٹا سکے
تو ان کی جائداد قرق کرا کے انہیں اس علت سے نجات دلائی۔ کمپنیوں کے حصے خرید ے۔
جتنا دھن بڑھتا گیا، اتنی حرص بڑھتی گئی۔ لیکن جب آزادی آئی آپ کی مسرت رخصت
ہو گئی۔ جب لوگ جشن آزادی میں چراغاں کر رہے تھے، آپ صفِ ماتم بچھائے بیٹھے تھے۔
آپ کو انگریز کے جانے کا غم ستا رہا تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کچھ دنوں کے بعد
آنریری مجسٹریٹی ختم ہو گئی۔ جاگیرداری کے قانون نافذ ہونے لگے۔ آپ کے عزیز کسی ریاست
کی دیوانی سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور ان کی ملازمت جانے سے آپ کی سونے کی
کان بند ہو گئی۔ جب ریاست کا وجود ہی ختم ہو گیا، دیوانی کیسے رہتی؟ انہوں نے جی بھر کر
سردار پٹیل کو کوسا۔ یہ بھی کیا شرافت ہے کہ لوگوں سے ان کی گدیاں چھین لیں! اور پھر خود کو
بھی کیا ملا؟ جاتے وقت تو دنیا سے خالی ہاتھ ہی گئے نا؟

اور یہ دبلے پتلے پریشان خاطر کون چلے آ رہے ہیں؟ سکول ماسٹر مادھو رام۔
وہ پچھلے تیس سال سے سکول میں پڑھا رہے ہیں۔ اور اب مہنگائی الاؤنس ملا کر پورے
ساٹھ پاتے ہیں۔ گھر میں آپ کی بیوی، چار بچے، ایک ودھوا بہن اور دو ودھوا ماں ہیں۔ ان
سب کے گذارے اور بچوں کی تعلیم کا انتظام ماسٹر صاحب کو خود کرنا پڑتا ہے۔ اور
بھلا خود نہ کریں تو کیا پڑوسی کریں یا نیتا؟ ضلع کے بہت سے نوجوان جو یہاں اور باہر

اونچے عہدوں پر سرفراز ہیں، معزز وکیل اور مجسٹریٹ، کامیاب بیوپاری اور سیٹھ، سب ماسٹر جی کے چیلے چانٹے رہ چکے ہیں۔ جس طرح سڑک کا سائن بورڈ، مسافروں کو منزل کی طرف جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود اپنی جگہ پر ساکن کھڑا رہتا ہے، اسی طرح مادھو رام بھی بیشمار لوگوں کو منزل پر پہنچانے کے بعد خود اس جگہ کھڑے یا بیٹھے ہیں۔ نیتا لوگ انھیں قومی معمار کا نام دے کر ان کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں اور اپنے ہر بھاشن میں طریقہ تعلیم کو سدھارنے کے ساتھ ساتھ قومی معمار کی پوزیشن کو بہترین بنانے کی تلقین کرتے ہیں اور طاقت ہاتھ لگنے پر بجٹ کو متوازن رکھنے کے لئے سب سے پہلا وار اس کی گردن پر کرتی ہیں۔ قومی معمار بڑی شانتی سے اس وار کو سہتا اور خاموش رہتا ہے۔ کیونکہ شانتی اور خاموشی قابل تعریف اوصاف ہیں اور قومی معمار کو اور زیادہ قابل تعریف بناتے ہیں۔

"بابو جی! کوئلے چاہئیں؟" آپ کے کان میں مہین آوازیں آتی ہیں۔

مڑ کر دیکھئے تین چار عورتیں آپ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں وہ ننگے پاؤں ہیں اور چوڑی دار پائجامے پہنے ہیں۔ گلے میں کپڑے کی تھیلی میں ان کے بچے لٹک رہے ہیں، اور پیٹھ پر کوئلے سے بھرے کلٹے (ٹوکرے) رکھے ہیں۔ وہ یہاں سے چھ میل دور نو ہزار فٹ کی بلندی پر سے پیٹھ پر کوئلے کے ٹوکرے رکھے، اور گلے میں بچے لٹکائے آتی ہیں، وہاں وہ کوئلہ بناتی ہیں اور یہاں شہر میں بیچنے آتی ہیں۔ سارا ایک کلٹا مشکل سے ایک روپے میں بکتا ہے۔ اس ایک روپیہ کا سودا لے کر جس میں عموماً آٹا یا تیل ہی ہو سکتا ہے، وہ چھ میل کا پہاڑی راستہ اور سخت چڑھائی طے کرتی ہیں۔ دسمبر میں سخت برف باری ہونے پر انہیں وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے، تاکہ نیچے جا کر اپریل تک پھر محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کا انتظام کر سکیں۔

آپ کی توجہ کوئلہ والی سے ہٹی تو لکڑی والے کی طرف مبذول ہو گئی۔ دائیں طرف ساتھ والی سڑک پر ایک وزنی شہتیری پیٹھ پر لادے اُس کے بوجھ سے جُھکا ہوا کوئی چلا آ رہا ہے۔ شاید مزدور ہے۔ یہ بھی وہیں سے آ رہا ہے، جہاں سے وہ عورتیں کوئلہ لاتی ہیں۔ پیٹھ پر شہتیر رکھے وہ چھ میل کا پہاڑی اور ناہموار راستہ طے کر کے چلا آ رہا ہے۔ وُہ بُری طرح ہانپ رہا ہے۔ اُس کے سارے جسم سے پسینہ چھوٹ رہا ہے۔ اتنی سخت مشقت کے بعد وہ صرف دو روپے کی مزدوری کا حقدار بنتا ہے، اور سارے کنبے کی پرورش کا بار اپنے کندھوں پر سنبھالتا ہے۔ اس بیسویں صدی میں جب سائنس نے ترقی کرتے کرتے قدرت پر فتح حاصل کر کے ایٹم اور ہائیڈروجن کی ایجاد کر لی ہے، اس ملک کا بدنصیب مزدور آج بھی پیٹھ پر منوں بوجھ لاد کر میلوں پیدل چلتا ہے۔ لیکن وہ اُسے بہت غنیمت سمجھتا ہے۔ اگر سائنس یہاں بھی پہونچ گئی تو وہ اُسے معاش کے اس ذریعہ سے بھی محروم کر دے گی۔

آخر میں آپ سے ملئے۔ آپ ہیں ہمارے نوجوان دوست بی۔ این۔ کپور، کالج کے طالب علم اور مشہور سٹوڈنٹ لیڈر۔ آپ نئی کٹ کا امریکن سوٹ پہنے ہیں۔ بیحد اونچا کوٹ اور کھلے اور اونچے پائنچوں والی پینٹ پہنے اس طرح معلوم دے رہے ہیں جیسے آپ ڈلہوزی کی ٹھنڈی سڑک پر نہیں، دریا کے کنارے دلدل میں چلے جا رہے ہیں۔ پہلے پوشاک میں انگریزوں کی نقل کرتے تھے، اور اب امریکنوں کی کیونکہ نقل کرنا آپ کا پیشہ ہے اور پیشے سے آپ مجبور ہیں۔ یہ مجبوری آپ کو امتحان میں بھی پریشان کرتی ہے۔ پچھلے سال آپ نے ہسٹری کے پرچے میں ڈٹ کر نقل کی، جب پکڑے گئے تو کچھ لڑکوں کی مدد سے اِن وجی لیٹر صاحب کی مرمت کرا دی۔ آخر لیڈری کا اور فائدہ ہی کیا؟

سزا سے بچنے کے لئے رشوت کا ہتھیار برتا، اس پر مزید سزا پڑی۔ اب آپ لڑکوں کی لیڈری چھوڑ کر، جنتا کی لیڈری کرتے ہیں۔ اور اگلے چناؤ میں کھڑے ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ کی ذاتِ مبارک سے دیش کی کتنی امیدیں وابستہ ہیں۔ اگر آپ وزیر بن کر قوم کی خدمت سرانجام نہ دے سکے، تو سفیر بن کر دوسرے ملکوں میں ہندوستان کا سر ضرور اونچا کر سکیں گے۔ جب آپ امریکن کٹ کا سوٹ پہن کر، اور سر پر فلیٹ رکھ کر، ہاتھ میں چھڑی اور منہ میں سگار لے کر چلتے ہیں تو کتنے شاندار لگتے ہیں۔ کلب میں جس انداز سے وسکی پیتے اور فلاش کھیلتے ہیں، بالکل اسی انداز سے سنیما میں سگریٹ پیتے اور ہلڑ بازی کرتے ہیں۔ ان کے ان کارناموں سے لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ نیتا بننے کے لئے رعب جمانا نہایت ضروری ہے اور یہ وصف آپ نے سکول میں ماسٹروں اور کالج میں پروفیسروں کی حکم عدولی اور ان سے بدکلامی کر کے حاصل کیا ہے۔

لیجئے صاحب لنچ کا وقت ہو گیا۔ سڑکیں تو چلتی رہیں گی، لیکن لنچ کا وقت تو بیچ لوٹ کر پھر نہیں آئے گا۔

نہ بھولنے والی یادیں

آج پھر تمہاری یاد آئی۔ یوں ہی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ایک عجیب احساس مجھ پر طاری ہو جاتا ہے اور بے اندازہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت میرا ماحول میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور میرے سامنے ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں صرف ایک ہی صورت بھاگتی، کھیلتی اور ناچتی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کا کتنا گراں مایہ لمحہ ہوتا ہے۔ کاش وہ لمحہ ایک طویل اور ہمیشہ رہنے والی گھڑی بن سکے تاکہ میں ساری آرزوؤں کو اس پر نچھاور کر دوں، اپنی تمناؤں کا خرمن بنا کر اس میں آگ لگا دوں۔

آج دولت و ثروت کے ہوتے ہوئے بھی میں بے چین رہتا ہوں عزت اور بڑائی میرا کھویا ہوا سکھ نہیں لوٹا سکتی۔ میری ولایت کی ڈگریاں اور میری بڑی ہی ہوئی پریکٹس مجھے راحت اور مسرت نہیں بخش سکتیں۔ زندگی ایک ہنگامہ معلوم ہوتی ہے، جس سے بچنے کے لئے میں تنہائی کا متلاشی رہتا ہوں اور جب اس تنہائی میں، دن بھر کی اذیت کے بعد اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرتا ہوں اس وقت

تم نہ جانے کہاں سے چپ چاپ آموجود ہوتی ہو۔ تمہاری آمد اپنے ساتھ کتنی یادیں لئے ہوئے آتی ہے۔ میری زندگی کی تاریکیوں میں اُجالا پھیلانے والی یہ یادیں کتنی لذّت بخش ہوتی ہیں۔ تاریکی سے مستور جنگل میں روشنی کی مدّھم جوت بھی کتنی حیات بخش ہوتی ہے! میں ان یادوں میں کھو جاتا ہوں۔

"کیوں؟ کیا بات ہے آج؟" میں پوچھ بیٹھتا ہوں۔ تم خاموش رہتی ہو۔ جیسے تم نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ میں اس سوال کو پھر دُہراتا ہوں۔ تم شاید اس سکوت کو توڑنا نہیں چاہتیں۔ میں ایک بار پھر وہی سوال کرتا ہوں۔ تم منھ پھیر لیتی ہو۔ لیکن اسی وقت کوئی کمرے میں آتا ہے، شاید اخبار بیچنے والا۔ پچھلے مہینے کے پیسے لینے آیا ہے۔ تم فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہو۔ تم اُس کے ساتھ گھُل مل کر باتیں کرتی ہو۔ اُسے دس روپے کا نوٹ دے کر اُس سے باقی پیسے واپس لیتی ہو۔ جب وہ جانے کے لئے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے، تم اُسے روک لیتی ہو، اور اُس سے طرح طرح کے سوالات کرتی ہو۔ "اُس مہینہ میں "سرسوتی" کیوں نہیں آئی۔ نہ جانے کبھی کبھی "مادھوری" کو کیا ہو جاتا ہے؟"

جب وہ جانا چاہتا ہے، تم اُسے پھر روک لیتی ہو۔ اب تم اُس سے روزانہ اخباروں کے دیوالی نمبر کے بارے میں پوچھتی ہو۔ میں پاس کھڑا سب سُنتا ہوں، لیکن تم مجھے نہیں دیکھتیں۔ کیا اس کا سبب ناراضی ہے؟ کوئی وجہ تو ہونی چاہئے؟

میں نہاں خانۂ دل کو ٹٹولتا ہوں۔ شاید کہیں کچھ محسوس ہو۔ شاید کچھ دن میرا تم سے نہ مل سکنا

تمہارے بُلانے پر نہ آسکنا تمہارے عتاب کا سبب ہو۔ لیکن یہ غصہ نہیں، سازش ہے، مجھے ذلیل کرنے کی اور اسی لئے شاید تم نے مجھے بُلوایا ہے۔ نوکر تو کہتا تھا، ضروری کام ہے۔ کیا ہے وہ ضروری کام؟ ہاں شاید یہی ہے وہ کام، اپنے گھر بُلا کر ذلیل کرنا!

نہ جانے کہاں سے میرے دل میں طوفان اُٹھا۔ ایک عجیب کیفیت مجھ پر چھا گئی۔ جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے پودا لرز اُٹھتا ہے، تمہارے اس سلوک سے میرا جسم لرز اُٹھا اور میں تیزی سے پیچھے مُڑا۔

سامنے سیڑھیاں تھیں، مجھے خبر تک نہ ہو سکی، کتنی جلدی میں نیچے سڑک پر آگیا۔ میرے کانوں میں آوازیں آئیں "ذرا ٹھہرئیے نا!...... میں نے کہا ...... آپ جا رہے ہیں؟........ لیکن کیوں؟... ... میں نے آپ سے بات بھی نہیں کی....... ضروری بات تھی........ سنئیے نا!........ ذرا ٹھہرئیے نا!!"

لیکن میں بھاگنے لگا۔ آواز کا ایک ایک لفظ میری ٹانگوں میں بجلی کی سی تیزی پیدا کرتا اور میں اور بھی تیز بھاگنے لگتا۔ جیسے یہ آوازیں مجھے ڈرا رہی تھیں جیسے میں کسی خوفناک دشمن سے بچنے کے لئے پناہ کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔

"بابوجی، بابوجی! ٹھہرئیے!!" اچانک کانوں میں آواز آئی۔ آپ کو .... بُلا رہی ہیں .... بابوجی..... با..... بو..... جی!"

میں اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔

اور اس کے بعد امتحان کے دن آئے۔ اس بار وہ میرے لئے کشش انگیز

نہ بن سکے۔ امتحان کے کمرے میں پرچے پر تمہاری ہی صورت نظر آتی۔ ہر سطر میں
تمہارا ہی نام چھپا ہوتا۔ بھلا ان پرچوں کو تمہارے نام سے کیا تعلق؟ آنکھوں کو
زور سے ملتا اور پرچے پر سوالات پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا۔ جواب لکھتے
وقت عجیب حالت ہو جاتی۔ لائنوں کی لائنیں تمہارے ہی نام سے بھر جاتیں۔
میں جھنجھلا اُٹھتا۔ آخر یہ کیا مذاق ہے؟ پھر پرچے کی طرف جھکتا۔ دل میدانِ
کارزار بن جاتا اور دو حریفوں میں شدید جنگ شروع ہو جاتی۔

ایک آواز آتی

"پاگل حسینوں سے لڑائی کیسی؟"

"دوسری آواز آتی" لیکن خودداری بھی تو کسی چیز کا نام ہے"؟

"ارے چغد ہو!"

"تو وہ چاہیں ذلیل کرتی پھریں"؟

اور یہ جنگ جاری رہتی۔ پھر مجھے پرچہ کا خیال آتا، لیکن پھر وہی نام وہی خیال۔
بیوقوف! شاید وہ تم سے مذاق کر رہی تھی، ناحق اتنا بگڑ بیٹھے، مذاق کو بھی
نہیں سمجھ سکتے؟ تم کسی سے عشق کرنے کے قابل نہیں ہو، محبوبہ کی دلنوازادا اؤں سے
بھی بگڑ جاتے ہو؟ انسان ہو یا حیوان؟

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ میں تم سے کبھی نہ ملوں گا، اور تم سے ناراضی کا سبب بھی نہ پوچھوں گا
بھلا کیوں ہار مانوں؟ اس کشمکش میں امتحان کا پورا وقت کٹ گیا، گھنٹی بجی اور پرچہ
مجھ سے چھین لیا گیا۔

ہوسٹل میں آکر بستر کتنا پیارا لگا، دروازہ بند کیا اور سر کے درد کا بہانہ

کر کے لیٹ رہا۔ لیکن وہی خیالات ——— لیٹے لیٹے دن بیتیا۔ رات آئی دوستوں کی ٹولی دروازہ پر آدھمکی۔ کتے، دھکے، اور شور، میرا جی جل اُٹھا۔ کیا انسان کو اتنی بھی آزادی نہیں، اگر وہ اپنی خواہش سے ہنس نہیں سکتا، تو کیا وہ اپنے اختیار سے رو بھی نہیں سکتا؟

سُدھیر حیران تھا کہ امتحان کی رات کو میں یوں چپ سادھے کیوں لیٹا ہوں؟ جیسے میرا لیٹنا گناہ ہو۔ پھر نصیحتوں کی بھرمار! غنیمت ہوا کہ کسی کو فقرے چست کرنے کی نہ سوجھی۔ میں دل کی سوزش کو دل ہی میں دبائے ہوئے تھا۔ اور یہ آگ مجھے جلا رہی تھی۔

امتحان کے باقی دن ایسے ہی گذرے۔ رات کو میں بجلی کے لیمپ کے نیچے نہ بیٹھ سکتا۔ امتحان میں ایک سوال بھی پورا نہ کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو کوستا۔ بلا وجہ امتحان میں اس طرح بیٹھنا کہاں کی دانشمندی تھی؟ آخر گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ نہ جانے ماماجی کتنی وقت سے خرچ بھیجتے تھے اب ایک سال کا بوجھ اور ان کے سر پڑے گا۔ پرنسپل اور پروفیسر کیا کہیں گے؟ وہ ہمیشہ میری عزت کرتے تھے کہاں تو امتحان میں سب سے اوّل آنا یقینی تھا۔ اور کہاں اب صرف پاس ہونے کے لالے پڑ رہے تھے۔ تمہارے غرور کے لئے بھی تو یہ بڑی چوٹ تھی! تم بھی، تو میرے سب سے اوّل رہنے پر پھولی نہ سماتی تھیں۔ تمہارا سر بھی تو فخر سے اونچا اُٹھ جاتا تھا۔ اب تم بھی سہیلیوں! میں تن کر نہ چل سکو گی۔ اس خیال سے مجھکو کچھ تسلی ہوئی۔ تمہارے لئے یہ سزا میرے احساس کو سکون دے رہی تھی۔

اپنے خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا، بند کمرے میں کرسی پر بیٹھا رہتا۔ نوکر آکر کھانا رکھ جاتا۔ بھوک تو ساتھ چھوڑ ہی گئی تھی، نیند بھی اُچاٹ ہو گئی۔

داڑھی بنوانے اور بال سنوارنے کا خیال بھی نہ آتا تھا، لیکن میں اپنی اس حالت میں مگن تھا، ہاں دوستوں نے شکایتیں شروع کر دیں، اُن کے شکووں کا زور بڑھنے لگا۔ ابتدا میں میری ناراضگی کے خیال سے خاموش رہتے، لیکن صحت کو برابر گرتا دیکھ کر وہ فکرمند ہو گئے۔

ایک دن ستہ تھیر، رام پرکاش، بندرا بن، گوربخش سنگھ اور حمید اختر کو ساتھ لیکر میرے کمرے میں گھس آیا۔ وہ سب مجھے زبردستی کھینچ کر باہر لے گئے۔ میرا انکار اُن پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ لارنس کی سیر کے بعد ہم لوٹے۔ ہوسٹل جانے کے بجائے میں یونیورسٹی کرکٹ گراؤنڈ کی طرف بڑھا۔ شام کی سیر میں یہیں کرتا تھا۔ وہاں کی ہر چیز سے مجھے اُنس تھا۔ اتنے دن کی غیر حاضری کے باعث میرا دل اور بھی کھنچا۔

منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔ سامنے لڑکیوں کے ایک جھرمٹ پر نظر پڑی، اور نگاہیں وہیں جم گئیں۔ یونہی مجھے وہاں دیکھ کر سب کی آنکھیں میری طرف اُٹھ گئیں۔ کچھ سرگوشیاں ہوئیں اور دو نگاہیں میری طرف بڑھیں۔ میں حیرت زدہ کھڑا رہا۔ دل میں آیا کہ بھاگ نکلوں۔ لیکن وہ لڑکی قریب آ چکی تھی۔

"ذرا میرے ساتھ آئیے گا۔"

"م..... م..... میں؟" میں نے گھبراہٹ کے ساتھ اور اپنی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ آپ۔"

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں کیا، میں تو دور سے درختوں کی آڑ میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔" میں نے صفائی کے طور پر کہا۔

"سچ مچ سورج ڈوب رہا ہے۔ ذرا پاس آ کر دیکھ لیجئے۔" وہ پہیلی بوجھنے کے انداز میں بولی اور آگے بڑھی۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ میرے پہنچنے پر لڑکیوں کا جھرمٹ ایک طرف ہٹ گیا۔ دیکھا تو تم زمین پر بیہوش پڑی تھیں۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں فوراً تمھارا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ سینہہ پربھا نے پچکے سے ایک گیلا رومال میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اُسے تمھارے مُنھ پر نچوڑا اور تمھاری آنکھوں پر پھیرا۔ دھیرے دھیرے تم نے آنکھیں کھولیں اور ایک لمبی آہ کھینچ کر پھر اسی طرح بند کر لیں۔

"اُٹھو بھی" سینہہ پربھا بولی۔

تم نے پھر آنکھیں کھولیں، اُن سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ آنسو صرف آنسو نہ تھے، اُن میں کچھ انگارے بھی آملے تھے۔

اس واقعہ کی ایک ایک بات ــــــ پوری تفصیل سے میرے دل پر نقش ہے۔ اکثر میں ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ ہمارا ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ جس میں کچھ باتیں مٹ جاتی ہیں اور کچھ ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتی ہیں۔ جیسے کچھ دنوں کے بعد میو ہسپتال میں ہماری ملاقات ــــــ

سدھیر بیمار تھا، اس لئے مجھے وہاں روز جانا پڑتا تھا۔ ایک دن تم اچانک مل گئیں۔ برآمدے میں کھڑے ہم نے گلوں اور شکووں کے دفتر کھول دیئے تھے کہ

ایک زخمی شخص کو ہمارے پاس سے لے جایا گیا۔ نہ جانے اُسے دیکھ کر تمہیں کیوں غش آ گیا میں گھبرا گیا۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے ہوش گم ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اُسی وقت پاس سے ایک ڈاکٹر گزرا۔ تمہیں بے ہوش دیکھ کر مجھے ڈانٹ کر بولا "جی اس طرح بوکھلائے ہوئے کیوں کھڑے ہو؟" اور اس نے جھٹ تمہیں گود میں اُٹھا کر اور ایک کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد ہی مجھے حقیقت کا علم ہوا۔ مجھے اس ڈاکٹر پر بہت غصّہ آیا۔ لیکن وہ غصّہ ناحق تھا۔ میں جلدی جلدی رومال سے تمہیں پنکھا جھلنے لگا۔ تیزی سے گھومتے ہوئے بجلی کے پنکھے پر مجھے ذرا بھی بھروسہ نہ تھا۔ اُسی وقت ایک چپراسی کو بھیج کر سنگترے منگوائے اور اُن کی پھانکیں ایک ایک کر کے تمہارے مُنھ میں ڈالنے لگا۔

"تمہیں غش سے اتنا کیوں پیار ہے؟" میں نے تمہارے باریک سے ہونٹوں کے بیچ میں آہستہ سے سنگترے کی پھانک رکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے نہیں، غش کو مجھ سے پیار ہے" تم نے دھیرے سے کہا۔ "اور اس سے مجھے تسلّی ملتی ہے۔"

"بھلا کیوں؟"

"اس لئے کہ کسی کو تو مجھ سے پیار ہے۔" تم سرد آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"اور اسی لئے مجھے اس سے نفرت ہے۔" میں نے سنگترے کی قاش کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"رقیب جو ٹھہرا۔"

تھیں گھر پہنچ کر میں نے لوٹنے کی اجازت مانگی تو تم نے کیا کیا سوال نہ کئے۔
"بھلا غش آنے پر مجھے کس نے اُٹھایا تھا؟"
"ایک خوش نصیب ڈاکٹر نے!"
"تم نے کیوں نہیں اُٹھایا؟" کچھ دیر بعد تم نے پوچھا۔
"اب کی مرتبہ غش آنے پر میں ہی اُٹھاؤں گا" اور تم نے ایک ہلکی سی چپت میرے منھ پر لگا دی۔
اب میں جیسے تمہارے گھر ہی کا ایک فرد تھا۔ ہر روز تمہارے یہاں حاضری دینا ضروری تھا۔ میرا آنا کسی پر گراں نہ گزرتا تھا۔ شاید کبھی کبھی تمہارے پتا جی کو کچھ بُرا لگتا ہو۔ لیکن لاڈ میں پلی ہوئی اکلوتی بیٹی کے سامنے کون دم مار سکتا ہے؟ تمہارے سامنے وہ بھی خاموش رہتے۔
ہم گھنٹوں باتوں میں محو رہتے۔ نہ جانے کتنے مسائل پر باتیں ہوتیں۔ کبھی کبھی تمہارے پتا جی بھی اس میں شامل ہو جاتے۔
تمہاری موجودگی میں زندگی حسن سے بھرپور حقیقت معلوم ہوتی۔ تمہارے قریب میں گزری ہوئی گھڑیاں چھوٹے چھوٹے لمحے معلوم ہوتیں، اور تمہاری غیر موجودگی میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ ایک صدی بن کر گزرتا۔
تنہائی میں دل پوچھتا "اس کا انجام جانتے ہو؟ اگر اسے نہ پا سکے تو؟ کیا زندہ رہ سکو گے؟"
لیکن اُسی وقت جواب ملتا۔ مگر تم اور ہو بھی کس کی سکتی ہو؟
یاد ہے جس دن تم چندر لیکھا سے ملنے گئی تھیں؛ اور مجھے اُس کے

تمہارے بھائی نے کالج میں سندیسہ بھیجا تھا۔ مجھے یہ حکم تھا کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔ لیکن دن ڈھلا ہوا تھا۔ تمہارا حسن شرماتے ہوئے چاند کو بھی شرمسار کر رہا تھا۔ راستے میں ایک پارک میں پہنچ کر میں نے کہا تھا۔

"ذرا ٹھہرو نا!"

"کیوں؟"

"میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ایسا نہ کہو" تم نے گھبرا کر کہا۔

"کس لیے؟"

"کیا پھر کبھی نہ دیکھو گے؟" تم نے اسی طرح گھبراہٹ کی حالت میں کہا

"ارے پگلی!" میں نے ہنس کر کہا "میں نے تمہیں اتنی کمزور تو نہ سمجھا تھا۔ ہاں ذرا سیدھی کھڑی رہو۔ بالکل تن کر۔ بس یوں۔"

"لو!" تم نے مسکرا کر کہا۔

"اور سنو!" میں نے سنجیدگی سے کہا "کیا تم میری ایک بات مان سکتی ہو؟"

"بھلا اور کس کی مانوں گی؟"

"تم روز نیلی ساڑی پہن کر اسی پارک میں ملا کرو۔"

تم ہنسی سے بل کھاتی ہوئی بولیں "کمال کر دیتے ہو بعض دفعہ تو تم، میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔"

"کیا تم ایسا نہ کرو گی؟"

"تمہارے لیے میں کیا نہیں کر سکتی رشی!" تم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے

کہا۔ پھر ایک سرد آہ کھینچ کر بولیں "رتیش، تمہارے لئے تو میں اس جسم کے ٹکڑے بھی کرا سکتی ہوں! لیکن تم......"

اور تم نے منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ نہ جانے کیوں تمھاری کنول جیسی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے جھٹ رومال نکال کر ان آنسوؤں کو پونچھا۔

"پگلی کہیں کی! تیرے پاس آنسوؤں کا سمندر ہے؟ مجھے بھی اس میں سے کچھ دے!"

"یہ بردان مت مانگو رتیش!" تم نے آہ بھر کر کہا۔ آنسو تمھاری آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

"سنو رتیش!" تم یکایک بول اٹھیں "آجکل تمھاری آنکھیں لال کیوں رہتی ہیں؟"

"شراب پیتا ہوں۔"

"شراب ——؟"

"ہاں محبت کی۔"

"کس کی محبت کی؟"

"یہ نہیں بتاؤنگا۔"

"تو میں بھی نہیں بتاؤں گی۔"

"کیا؟"

"کہ میں ہر روز کسی کے سپنے دیکھتی ہوں۔"

"سپنوں میں کیا دیکھتی ہو؟"

"یہی کہ ہم دور آکاش میں اُڑے جا رہے ہیں۔ دنیا کی نگاہیں ہماری اڑان کی تاب نہیں لاسکتیں۔ اور سنو رتیش ایک رات مجھے عجیب سپنا دکھائی دیا۔"

"کیا؟"

"کہ تم مجھے اپنی باہوں میں تھامے کھڑے ہو۔ اور ماتا جی ہمیں دیکھ لیتی ہیں۔"

"کیا کہتی ہیں وہ؟"

"تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"سچ مچ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن ایسا کہنے کے بعد وہ پچھتا رہی ہیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو رمیش! ...."

"کہو نا رک کیوں گئیں؟"

"اب اگر ماتا جی تم سے پوچھیں تو ہاں کر دینا!"

"کیا پوچھیں گی؟"

"جاؤ، مجھے بناؤ مت، تم سمجھتے ہو اور پھر بھی پوچھتے ہو......"

جب لوٹ کر آیا تو ماما جی کا تار پڑا تھا۔ امتحان ختم ہوئے کئی دن ہو چکے تھے اور میں ابھی وہیں تھا۔ کوئی بہانہ بھی نہ کر سکتا تھا تار میں لکھا تھا

"تمہاری ممانی سخت بیمار ہیں جلدی آؤ۔"

گاڑی رات کو آتی تھی۔ تم سے ملنے کا وقت نہ تھا، پھر میں جانتا تھا کہ جلدی لوٹ آؤنگا۔

گھر پر اگلے دن پارٹی تھی۔ شہر کے تمام معزز لوگ مدعو تھے۔ باہر باجہ بج رہا تھا۔ اندر عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ ہر سال ماما جی میرا جنم دن اسی دھوم دھام سے مناتے تھے۔

جب سارے مہمان آ گئے تو ماما جی کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کرکے بولے۔

"آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرا رتیش وکالت کا امتحان دے کر آیا ہے بھلا ہمیشہ کی طرح رتیش کے اوّل آنے میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ میں اپنے بچپن کے دوست لالہ کندن لال کو ناراض نہ کر سکتا تھا۔ اُن کے اصرار پر میں نے اُن کی بیٹی کا رشتہ رتیش کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے آپ لوگوں کو تکلیف دی گئی ہے۔"

چاروں طرف سے مبارکباد کی بارش ہونے لگی۔ میرے دل پر ایک ایک لفظ بجلی بن کر گر رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے میرے سینہ پر ایک وزنی پتھر رکھ دیا ہے۔ میں درد کی شدّت سے کراہ رہا تھا۔ لیکن بوجھ کی زیادتی میری آواز کو دبائے ہوئے تھی۔ نہ مجھ میں اُٹھنے کی طاقت تھی، نہ شور مچانے کی۔ ہزار کوشش کے باوجود میری آواز نہیں نکل سکی۔ لاکھ جتن کرنے کے باوجود میں چیخ نہیں سکا۔ حملہ اتنا اچانک اور سخت تھا کہ اُسے روکنے کا موقع نہیں ملا۔ میں پتھر کے بے جان اور بے بس بُت کی طرح بیٹھا تھا۔

منت، سماجت، بحث، مباحثہ اور رونا دھونا بے سود ثابت ہوا۔ گویا

دھمکی بھی کارگر نہ ہوئی۔ ماما جی بولے۔

"بیٹا۔ ابھی تم بچے ہی تھے۔ جب سے لالہ کندن سے وعدہ کئے بیٹھا ہوا
ان کی لڑکی بی اے پاس ہے تمہاری ممانی تو اس پر جان چھڑکتی ہے پھر وہ تم سے
کتنی محبت کرتی ہے۔ کیا تم ایسی جذباتی ممانی کو ناراض کرنے کا خیال بھی کر سکتے
اور پھر تمہارے لئے تو وہ ماں سے بھی زیادہ ہے۔ تمہیں تو ماں کی یاد بھی نہ آتی ہوگی۔
اس نے آج تک تمہیں ماں کی یاد نہیں آنے دی۔ تمہاری وجہ سے اسے اپنی اولاد
نہ ہونے کا ذرا بھی دکھ نہیں ہوا تمہیں اس کی دنیا ہو۔ آج اس کا دل دکھا کر دیکھو
کل اسے جیتی نہ پاؤ گے۔"

پھر بولے۔

"کامنی کو تو تم جانتے ہی ہو۔ کتنے سالوں سے من مندر میں ایک ہی دیوتا
تصویر لئے بیٹھی ہے۔ اگر وہ تصویر اس سے چھن گئی تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا

کچھ دیر کے بعد بولے۔

"بیٹا! مجھ پر بھی تو دیا کرو۔ اس بڑھاپے میں تو مجھے ذلیل نہ کرو۔ تمہارے سوا
میرا ہے بھی کون، میری صرف ایک ہی تمنا ہے۔ ان سفید بالوں کی لاج
رکھو۔ لیکن اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہو تو انکار کرنے سے پہلے مجھے زہر دیدو
..... "ماما جی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ان سے چمٹ کر میں چیخ اٹھا۔

ان کی آنکھوں سے سوتے پھوٹ پھوٹ کر میرے سر کو بھگو رہے تھے۔ اور
میری آنکھوں سے، پانی بہہ بہہ کر زمین کو تر کر رہا تھا۔

"اُسی وقت کامنی آ کر کہتی ہے۔ آئیے، کھانا تیار ہے۔ زیادہ نہ سوچا کیجئے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔"

میں چونک کر اُس کی طرف دیکھتا ہوں، وہ مسکرا رہی ہے۔
لیکن میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے تمہارا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ۔ میرے منھ سے ایک دبی آہ نکل جاتی ہے...... کامنی کہتی ہے زیادہ نہ سوچا کرو بھلا ان یادوں پر کس کا بس ہے؟ یہ کبھی نہ بھولنے والی یادیں — یہ یادیں جو شیریں بھی ہیں اور تلخ بھی!

پہلگام سے چندن باڑی تک

متفقہ طور پر یہ قرار پایا کہ اگلے دن چندن باڑی چلیں۔

"کل صبح ہی چار گھوڑوں کا انتظام کرنا پڑے گا" میں نے تجویز پیش کی۔

"مجھے بھی گھوڑے پر بیٹھنا ہوگا؟" کرشن نے عینک کے شیشوں میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے" مدھو نے جواب دیا" اور گھوڑا آپ پر کیسے بیٹھے گا؟"

"میں اصولاً گھوڑے پر نہیں بیٹھتا" اس نے کہا۔

"اصولاً گدھے پر بیٹھ لینا" مدھو بولا۔

میں ان کے اصولوں سے بخوبی واقف تھا۔ ان کا سب سے سنہری اصول گانٹھ کو مضبوطی سے باندھ کر رکھیں۔ میں نے ایک تجویز پیش کی۔

اگر ہم دونوں مل کر ایک گھوڑا لے لیں تو؟"

ان کی باچھیں کھِل گئیں۔ جب چہرے پر ابھی ایک منٹ پہلے ہوائیاں

اڑ رہی تھیں، وہاں اب رونق ناچنے لگی۔ وہ فرطِ مسرت سے اُٹھے، اور میری طرف لپکے۔
میں نے سمجھا کہ سودا کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ میں پھرتی سے اپنی جگہ سے اُٹھا، اور میز کے پار
کھڑا ہو گیا۔ مدافعت کے طور پر میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر مرض زیادہ ستانے لگے گا تو میز پر
پڑی بوتل سے ان کا سواگت کروں گا۔

"خبردار! آگے قدم بڑھایا۔" میں نے کرشن کو للکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے بات ایسی کی ہے کہ تمہاری بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔" وہ بولے۔

"ارے بلائیں کیا لو گے۔ یہ خوبانی لو۔" مدھو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ خوبانی
کو دیکھ کر کرشن بلاؤں کو بھول گیا، اور ان کے ساتھ محو ہو گیا۔ کوئی سیر بھر کھانے کے بعد بولا۔

"تو یہ طے پایا کہ میں اور آپ ایک گھوڑا کر لیں......"

"اور اسے نصف نصف بانٹ لیں۔" میں نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا

"نہیں میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں کے لئے ایک گھوڑا کافی ہے۔
اس طرح ہم پہاڑ کی چڑھائی کا لطف بھی لے سکیں گے، اور گھوڑے کی سواری کا بھی۔"

"......رنگ بھی چوکھا آئے۔" مدھو نے چسکی لی۔

ہم میں سے اس سے پہلے کوئی چندن باڑی نہیں گیا تھا۔ اور سب نے اس کے
بارے میں مختلف باتیں سن رکھی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہاں سردی ہوتی ہے، کوئی کہتا گرمی۔
مدھو کا خیال تھا کہ وہاں دن میں برف پگھلتی ہے، کرشن کہتا تھا رات کو۔ ایک کہتا کہ علی الصبح
چلنا چاہئے، دوسرا کہتا کہ دھوپ تیز ہونے پر جانا مفید ہے۔ ایک کے خیال میں پیدل
چلنے میں مزہ آتا ہے، دوسرے کے خیال میں گھوڑے کی سواری میں۔

"میں نہیں سمجھتا کہ لوگ اکیلے کیسے لطف اٹھا سکتے ہیں؟" کرشن نے کہا۔

"صحبت بد سے اکیلے جانا بدرجہا بہتر ہے۔" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
کرشن نے اشارہ اپنی طرف سمجھ کر، ناراض ہونے کی کوشش کی۔ مدھو کو چند خوبانیوں سے جدا ہونا پڑا۔

اگلے دن صبح چھ بجے میری آنکھ کھلی، تو میں نے مدھو کو آواز دی۔ اس نے حسب معمول جواب دیا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے کرشن کو آواز دی۔ اس نے کہا "میں سو تو نہیں رہا۔" جاگ میں بھی رہا تھا۔ صرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد ساڑھے سات بجے میری آنکھ کھلی۔ دونوں کو پھر آواز دی۔ اور انہوں نے بالکل وہی جواب دیا، جیسے رٹ رکھا تھا۔ آٹھ بجے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چونکہ وہ بھی جاگ رہے تھے، وہ دونوں بھی اٹھ بیٹھے۔ نو بجے تک ہاتھ منہ دھویا دس بجے تک ناشتہ ختم کیا اور چل پڑے۔

جب ہم سڑک پر پہنچے تو ہمیں دیکھتے ہی گھوڑے والوں کا جم غفیر ہم پر لپکا۔ کرشن نے سمجھا کہ شاید حملہ کرنے آرہے ہیں۔ وہ واپس بھاگنے ہی کو تھا لیکن مدھو نے اسے دلاسا دیا۔ گھوڑے والوں نے ہم چیخ مچادی۔ وہ شور کہ الاماں۔ "صاحب میرے گھوڑے پر آئیے۔" "صاحب! اس کا گھوڑا کسی کام کا نہیں، میری گھوڑی کبوتری کی طرح جاتی ہے۔" "اڑے صاحب! جب گھر سے اتنے سو میل دور آئے ہو تو ٹٹو پر کیوں بیٹھتے ہو؟"

"کیا دام لو گے؟" مدھو نے ایک سے پوچھا۔

"گھوڑے کے" اس نے جواب میں پوچھا۔

"گھوڑے کے نہیں سواری کے۔"

"ریٹ تو تین ہے۔ آپ سے پانچ ہی لیں گے۔" اس نے رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟"

"اب خدا نے آپ کو دو گھوڑوں کا جسم دیا ہے، اسے ایک گھوڑے کو اٹھانا پڑے گا......"

"بکو نہیں"۔ مدھو نے اپنی چھڑی کو زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا۔

"مار ڈالا" کرشن زور سے چلایا۔ چھڑی اس کے پاؤں سے جا ٹکرائی تھی۔

"اچھا آپ چار ہی دینا"۔ گھوڑے والے نے کہا اور ان دونوں صاحبوں کو تین تین ہی دینے ہونگے اور آپ کی بچی کو دو"۔

"لیکن ہم تو صرف ایک گھوڑا لیں گے اور اس کے چار آنے کم دیں گے"۔ کرشن نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"چار مینار کے سگریٹ لیں گے"۔ وہ بولا۔

"اوہ!" میں نے خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

مدھو نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑوں پر نظر دوڑائی، جیسے جیون ساتھی کا انتخاب مقصود ہو، اور ایک سفید پلی ہوئی گھوڑی پر نظر جما کر بولے۔

"ہمیں یہ پسند ہے"۔

"اس بیچاری سے بھی پوچھ لو"۔ کرشن نے دھیرے سے مشورہ دیا۔

"تم خاموش رہو جی"۔ مدھو نے ڈانٹ بتلائی۔

"تو آپ کے لئے دوسری یہ گھوڑی موزوں رہے گی"۔ ایک موٹے تازے کشمیری نے مدھو کو مخاطب کر کے کہا۔

"بس دو کیا کروں گا؟"

"سرکار! ایک گھوڑی تو دم توڑ دے گی۔"

"آپ خاموش رہئے!" مدھو نے چشمے کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"جی حضور!"

سب سے پہلے مدھو کو گھوڑی پر بٹھلایا گیا۔ اس کی مدد کے لئے دو ہم تھے، اور تین گھوڑے والے سب سے پہلے جو انہوں نے چھلانگ لگائی تو ایک کشمیری پر آرہے۔ پلٹ کے آئے اور پھر چھلانگے، تو دم کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ لات کو گھماتے ہوئے سیدھے بیٹھنے کی کوشش کی، تو کیلوں والا بوٹ دوسرے کشمیری کے جما دیا: جو اس نے اپنے کمبل پر دبوچا۔ طے یہ پایا کہ نیچے اتر کر پھر چڑھیں۔ ساتھ والی دکان سے ایک میز لائی گئی، اور اس کی مدد سے وہ گھوڑی پر بیٹھنے میں کامیاب ہوئے۔

"اس میز کو ساتھ ہی گھوڑی پر رکھ لو۔" کرشن نے مشورہ دیا۔

"نہیں صاحب، بوجھ بڑھ جائے گا۔" گھوڑے والے پر دلشٹ کیا۔ کرشن نے مدھو کے اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"گھوڑے کو بٹھلاؤ۔"

"بھئی گھوڑا ہے، اونٹ نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس میں کیا فرق ہے؟" وہ بولا۔

"جو آپ میں اور مدھو میں ہے۔"

مدھو کرشن اور شمو گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ میں اور ایک سائیس پیدل روانہ ہو گئے، چندن باڑی کی طرف۔

آدھ میل چلنے کے بعد مدھو نے پوچھا۔
"کرشن! اٹیچی کیس لائے ہو؟"
کرشن نے مجھ سے پوچھا۔ اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب بھلا مجھ سے کہا ہی
کس نے تھا!
"لیکن اس میں تو شام کی چائے کے لئے سامان ہے!"
سامان تو چندن باڑی میں مل جائے گا" میں نے کہا۔
"اگر سامان کا مطلب برف ہے تو وہاں ضرور ملے گی"
مدھو نے تمسخرانہ انداز سے کہا، لیکن کسی نے ان کی بات کی داد نہ دی۔ کچھ دیر کے
بعد وہ پھر بولے
"اٹیچی کیس لانا ہی ہوگا، اس میں چائے کا سامان ہے۔ اور خاص کر میں خالی چائے
کبھی نہیں پیتا"
"صبر کا گھونٹ ہی پی لینا" کرشن نے بلا فیس مشورہ دیا۔
"Dont Be Vulgar" مدھو نے چلا کر کہا۔ پر ان تو حسب معمول
غیر متاثر رہا۔ اس کا گھوڑا ہنہنا دیا۔ دوسرے دو گھوڑوں نے بھی اس کی نقل کی۔
ہم سب واپس لوٹے۔ میں ہوٹل میں گیا، لیکن چابی مدھو کے پاس ہونے کی وجہ سے
پھر لوٹا، اور اٹیچی کیس لے کر واپس آیا۔
کارواں پھر روانہ ہوا۔ ایک میل جانے کے بعد مدھو نے کہا۔
"کرشن۔ دیکھو کتنا خوبصورت نظارہ ہے۔ لاؤ کیمرہ اس کا فوٹو لیں"
"نظارے تو یہاں ایسے بیسیوں ہیں" میں نے کہا۔

"بڑے بدذوق ہو جی۔" مدھو بولا۔ "کرشن ، تم نکالو کیمرہ۔"

"میرے پاس کوئی الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں ، جس کی مدد سے کیمرہ نکال سکوں کیونکہ وہ تو ہوٹل میں میرے بیگ میں پڑا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"افوہ!" مدھو نے چہرے پر غصہ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے سب مزا ہی کرکرا کر دیا۔"

"تو آپ کا مزا محض کیمرے میں ہے!" کرشن نے آگ پر تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔

"بکو مت اور واپس جا کر کیمرہ لاؤ۔" مدھو نے چلّا کر حکم دیا۔

"سب میرے ساتھ چلیں تو جاؤں گا۔" کرشن نے تجویز پیش کی۔

"پانچ روپے ملیں تو میں تیار ہوں۔" میں نے شرط پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پانچ نہیں ، پانچ سو!" کرشن نے غصے کے انداز سے کہا۔ اس نے گھوڑے کو واپس لوٹایا ، ایڑ لگائی اور غائب ہو گیا۔ اور جلد ہی کیمرا لے کر لوٹ آیا۔

"لیکن یہ تو کوئی اور کیمرا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوٹل کے کمرے کی چابیاں تو مدھو کے پاس ہیں۔ اس لیے میں دوکان سے کرایہ پر لے آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اپنا دماغ کرایے پر چڑھا آئے ہو۔" مدھو نے چٹکی لی۔

"اگر تم مجھے ستاؤ گے تو میں شام کی چائے کے لوازم ختم کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" ہم خاموش ہو گئے۔ اسی میں بہتری تھی۔

اتنے میں دس بج چکے تھے ، اور دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ دو صاحبان جو پہلگام آ کر ہمارے واقف اور کرشن کے دوست بنے تھے ، فرمانے لگے کہ ہمیں صبح آٹھ بجے چلنا چاہئے

تھا۔ ان میں سے ایک صاحب بولے۔

"لیکن ہمیں یہ پہلے کسی بے وقوف نے نہیں بتایا۔"

"اور ہمیں بھی۔" میں نے کہا۔ مدھو حسب دستور ہنسنے لگا۔ اس کی گھوڑی نے اس کی پیروی کی۔ سردار صاحب اسے یوں بے موقعہ ہنستے دیکھ کر اپنے ساتھی سے بولے "سودا کا مرض ہے۔ آؤ چلیں۔"

اور ہم بھی چلے۔ کرشن، مدھو، اور شمو گھوڑوں پر۔ میں اور سائیس پیدل۔ طے یہ پایا کہ ہم باری باری گھوڑے کی سواری کریں گے۔ کشمیر آکر ہماری جو شامت آئی، ہم نے کرشن کو وزیر خزانہ بنا دیا۔ حکومت بری شے ہے اس کا سب سے پہلے اثر دماغ پر ہوتا ہے اب کرشن تو ایک معمولی انسان ٹھہرا۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھس گئی کہ منیجر کیا بنا، نظام سقہ بن گیا، اور لگا چمڑے کی چلانے۔ جو بات اس کے منہ سے نکل گئی، وہ پتھر کی لکیر۔ جو بات آپ نے کی، وہ ایک دم غلط۔ جب ہم سب کو گرمی لگتی، وہ سویٹر پہن لیتا۔ اور جب ہمیں سویٹر کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ قمیص اتار دیتا۔ جب صبح کے وقت ہوٹل کی کھڑکی میں سے سامنے پہاڑ پر سورج کی سرخ شعاعوں کو سفید برف سے ہم آغوش ہوتے دیکھ کر ہم چلا کر کہتا۔ "دیکھو کتنا حسین نظارہ ہے!" تو وہ عجیب ہنسی ہنس کر کہتا "مجھے تو اس میں کہیں حسن نظر نہیں آرہا۔" اور جب اس وقت پہلگام ہوٹل کا چالیس سالہ بیرا چائے لے کر آکھڑا ہوتا اور مدھو کہتا۔ "تمہاری نظر میں حسن ہے؟" تو وہ ناراضی سے منہ پھیر لیتا۔

ہمارے جھگڑے کے بے شمار موضوع تھے۔ مثلاً سیر ناشتے سے پہلے ہو یا ناشتہ سیر سے پہلے۔ گوبھی کھائیں یا مٹر۔ بس میں فرنٹ سیٹ پر وہ بیٹھیں یا ہیں۔ رات کو شیر کشمیر پارک میں جا کر ریڈیو پر فلمی ریکارڈ سنیں یا بنواڑی کی دوکان پر۔ کھانا میوہ سنگھ کے ہوٹل میں

کھائیں یا پکوڑی مل کے ڈھابے پر۔ بہ حصولِ وسعت توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔ کرشن سے کہتا کہ میں غلطی پر تھا اور مجھ سے کہتا کہ کرشن بہت ضدی ہے۔

وزیرِ خزانہ ہونے کی حیثیت سے اور عمر میں ہم دونوں سے چھوٹا اور عقل میں کم ہونے کی وجہ سے کرشن نے مشترکہ گھوڑے کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے جملہ حقوق ریزرو کر رکھے تھے۔ کبھی تو وہ کہتا کہ ہم باری باری آدھ آدھ گھنٹے کے لئے گھوڑے کی سواری کریں گے، اور کبھی کہتا کہ ہر شخص ایک ایک میل تک سوار رہے گا۔ اب وقت اور فاصلہ کا تصفیہ کرنے کے جملہ حقوق بھی بحق تحریر محفوظ تھے۔ عموماً اترائی آنے پر وہ اتر جاتا اور مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتا اور چڑھائی آنے پر باگ کو پکڑ کر مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کرتا، اور ساتھ ہی میری طرف چھڑی کو بڑھاتا۔ اس نے ایک دستور بنا لیا کہ پیدل چلنے والا چھڑی لے کر چلے گا۔ گویا گھوڑے کی سواری کے مقابلے میں وہ چھڑی سے تسکین حاصل کرتا۔ میں خاموشی سے گھوڑے سے اترتا اور چھڑی سنبھال کر پیدل چلنے لگتا۔ جونہی میں اپنی تکلیف کے اس ذمہ دار کو کوسنے کے منصوبے باندھتا، قدرت میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی۔

داہنی طرف دریا تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسلسل نغمہ تھا، اور نغمے میں ایک دائمی موسیقی تھی۔ اپنے معمولی آغاز اور غیر معمولی تنہائی کی پروا نہ کرتے ہوئے، کئی ارمانوں کو دل میں چھپائے اور کئی دلوں کو سینے میں، وہ ایک لمبے اور نامعلوم سفر پر چل نکلا تھا۔ راستے میں یہاں وہاں اور ہر کہیں اس سے ہمسفر آملے تھے۔ جو اپنی انفرادیت کو ایک دم مٹا کر اس کی ہستی میں جذب ہو گئے تھے۔ ان کا مجموعی نغمہ، چوٹیوں نے لپٹے ہوئے برف کے شانت ذخیروں سے چھیڑ خانی کرتا۔ سورج کی شعاعیں ان کے دل میں گداز

پیدا کرتیں اور اس کی خاموش کرنیں ان کے کانوں میں زندگی کا راز پھونکتیں۔ زندگی سے ہمکنار ہونے کی امٹ خواہش ان میں طوفان بپا کردیتی، اور وہ اپنے خزانوں کو لٹانے، اور اپنی بیش بہا پونجی کو بہانے کا تہیہ کرلیتے۔ فلک بوس سفید چوٹیوں سے پانی کی لاتعداد لکیریں، پہاڑ کی بلند وادیوں کا سہارا لے کر بہنے لگتیں، جیسے کئی حسینوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بے شمار سوتے بہہ رہے ہوں۔ ندی سے ہم آغوش ہوتے ہی وہ اپنی خاموش تانوں کو اس کے بلند نغموں میں ملا دیتے، اور ناچتے اور شور مچاتے منزل کی طرف گامزن ہو جاتے۔

دس ہزار فٹ کی بلندی پر، سورج کی کرنیں برف کو پگھلا رہی تھیں، تاکہ انسانوں کے استعمال کے لئے پانی کا ذخیرہ ختم نہ ہو سکے، ان کے کھیت سیراب ہو سکیں، اور ان کی فصلیں اُگ سکیں، اور جب یہ ندیاں اور نالے اپنے محبوب سمندر میں جا ملتے، تو یہی کرنیں ان کو بادل کی شکل میں بدل دیتیں، اور یہی بادل برف بن کر پہاڑ پر جم جاتے، اور پھر یہی برف پگھل کر پانی میں تبدیل ہو جاتی۔ "یہ کرنوں کا کھیل زندگی کا مسلسل کھیل ہے!" پاس سے گزرتے ہوئے ایک سادھو نے مجھ سے دھیرے سے کہا۔ "یہاں کچھ ضائع نہیں ہوتا۔ صرف مادہ روپ بدلتا ہے۔ برف سے پانی، پانی سے برف، جیسے زندگی سے موت، موت سے زندگی!"

"آپ کے خیال میں زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں، باواجی؟" میں نے حیران ہو کر ان سے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" انھوں نے فوراً جواب دیا۔ "دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، ایک ہی سکے کے دو پہلو!"

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا امرناتھ کی طرف چلا گیا۔ . . .

مجھے کرشن مہاراج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اور یہ صاحب بہادر بغل میں کیمرہ اور گلے میں سویٹر لٹکائے، آنکھوں میں چشمہ اور سر پر ہیٹ لگائے، اس طرح شان سے بیٹھے ہوئی سواری کا مزہ لے رہے تھے، جیسے باوا کا گھوڑا ہو۔ وہ اس بات کو ایک دم نظر انداز کئے بیٹھے تھے کہ کرایہ کا گھوڑا ہے اور وہ بھی مشترکہ۔ انھیں اس طرح اکڑ کر بیٹھے دیکھ کر میری چھاتی پر سانپ لوٹنے لگا۔ اور لوٹتا بھی کیوں نہ؟ پیسے آدھے میں بھروں اور ٹانگیں پوری تڑوا ؤں۔ مدھو چپکے سے میگزین میں دیا سلائی دکھا دیتا۔ مجھ سے بولا

"کیا تم نہیں بیٹھو گے؟"

"کہاں چٹان پر؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"نہیں گھوڑے پر۔"

"اس پر تو کرشن بیٹھا ہے۔"

"اوہ!" وہ بولا۔ جیسے اسے وہ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

کرشن نے جان بوجھ کر اشارے کو سمجھنے سے انکار کر دیا اور ایک فلمی دھن گانے لگا۔ اب بھلا مجھے غصہ کیوں نہ آتا؟ جلن کو شانت کرنے کے لئے میں نے اوک سے دریا کا برفانی پانی پیا۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔

"یہاں بیٹھ کر ذرا سستانا چاہئے۔" میں نے ہوا میں تجویز چھوڑی۔ مدھو نے حسب معمول اس تجویز کو قبول فرمایا، اور کرشن نے حسبِ عادت اسے ٹھکرا دیا۔

"یہاں کونسی جگہ سستانے کے لئے ہے؟" وہ بولا۔

"کونسی جگہ نہیں ہے؟" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ارے اتر بھی اب۔" مدھو نے ڈانٹ بتلا کر کہا
"تم اتر جاؤ۔ میں تو گھوڑے پر ہی سستاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔
"گھوڑا ابھی تو سستائے گا۔" مدھو نے اترتے ہوئے کہا۔
"ہاں صاحب چڑھائی میں تھک گیا ہے۔ ذرا آرام کرنا ہی چاہئے۔" میرے اشارہ کرنے پر سائیس نے اپنی لمبی خاموشی کو زندگی میں پہلی بار توڑتے ہوئے کہا۔
اب کرشن کو مات کھانی پڑی اور وہ بادلِ ناخواستہ اُتر پڑا۔
میں موقع کی تاک میں تھا۔ جوں ہی وہ اوک سے ندی کا پانی پینے لگا، میں لپک کر گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ پانچ منٹ کی جد وجہد کے بعد اور کرشن، سائیس اور چند راہ گیروں کی مدد سے مدھو بھی گھوڑے کی پیٹھ پر جم گیا، اور کارواں روانہ ہوا۔
برف کے پل تک سخت چڑھائی تھی، اور کرشن کو وہاں پیدل چلنا پڑا۔
برف کا پل قدرت کا ایک بہترین شاہکار تھا اور قدرتی کاریگری کا ایک بے نظیر عجوبہ۔ دو دیو ہیکل چٹانوں کے سہارے یہ قدرتی پل کھڑا تھا۔ نیچے سے تین دھاریوں کی شکل میں بہتا ہوا، ایک مسلسل شور مچاتا ہوا دریا بہہ رہا تھا۔ اوپر برف کا فرش تھا اور اس کے ساتھ برف کی بلند دیوار کھڑی تھی۔ دریا کی تندی بھیانک تھی اور تیزی خطرناک۔
مدھو کو گھوڑے سے اتار کر اس پل پر لائے تاکہ اس کی تکان دور ہو جائے۔ اس کی تکان نے اس ہی کو نہیں، ہم سب کو، اور کشمیر کی ساری وادی کو پریشان کر رکھا تھا۔ باتوں باتوں میں ہم برف کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مدھو نے میرے کان میں پھونک ماری اور حکم کی تعمیل میں میرے ہاتھ کرشن کی ٹانگوں میں جا پڑے اور انھیں کھینچنے لگے جیسا کہ خیال تھا ٹانگوں کے ساتھ اس کا جسم بھی پہاڑ سے لڑھکنے لگا، اور کچھ دو چار منٹ بعد برف کے فرش پر آ رہا۔

زندگی بے حد پھیکی ہونے کی وجہ سے کرشن سفر کو جاری رکھنے اور ندی کی روانی میں جانے کے خیال سے کھیل ہی رہا تھا کہ ایک حسینہ کی بے ساختہ ہنسی نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ صرف اس لڑکی کی نظرِ عتاب کے لئے کرشن نے پہلگام میں کئی دن سعی ناکام کی تھی۔ اور اب بلا کوشش نظرِ عتاب کی جگہ نظرِ عنایت میسّر ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ زندگی اتنی بے رنگ و بو نہیں جتنی وہ سمجھے بیٹھا تھا، اور حسینوں کی مسکراہٹ اس میں رنگ بھر سکتی ہے۔ وہ نئے جوش کے ساتھ اٹھا، پہاڑ پر چڑھا اور وہاں سے پھسل پڑا۔ اسے پھر انعام ملا۔ اس نے چاہا کہ اس کھیل کو جاری رکھوں، لیکن مدھو کے دل کی جلن نے اس کے منصوبے کو پورا نہ ہونے دیا۔ ہم پھر روانہ ہوئے۔

چندن باڑی میں ایک ہی ہوٹل تھا، اگر دو تین چولھوں کے اوپر ایک خستہ حال چھپر کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے۔ ایک لکڑی کے شیڈ کے نیچے اٹھارویں صدی کی بنی ہوئی میزوں اور کرسیوں پر، دو للنائیں اور چار لالے مونگ کی دال، اور کدو کی سبزی پر برس رہے تھے ایک لڑکا گھی ملے ہوئے دودھ کی مدد سے مٹن کی پلیٹ کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مدھو کے منھ میں پانی بھر آیا، اور اس نے بھی پلیٹوں کا آرڈر دیا۔ تین طشتریاں صاف کرنے کے بعد ہوٹل والے سے بولا۔

"ارے مہنگا سنگھ! یہ تو کچا تھا"

"صاحب! آپ چولھے کے پاس آ بیٹھئے، ابھی پک جائے گا"

بھوک تیز کرنے کے لئے مدھو گھاس پر لیٹ گیا، کرشن مٹر کے دانے نکالنے لگ گیا اور میں دوسرے برف کے پل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سبزی کا انتظام کرا کے کرشن بھی پل پر آ رہا۔ مدھو نے کچھ کروٹیں لے ڈالیں، اور شمو نے کھانا ختم کیا خدا خدا کر کے

سبزی تیار ہوئی۔ لگاتار گھوڑے پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے مدھو کو بھوک بہت لگ رہی تھی۔ اس نے دو درجن چپاتی، اور آدھی درجن طشتریاں صاف کیں اور بیٹ گیا۔ اسے گھاس میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر کرشن غصے سے بولا۔

"کیا تم سات سو میل کا فاصلہ محض اس لئے طے کر کے آئے ہو کہ گدھے کی طرح یہاں آکر لیٹو؟" لیکن اس کے جواب میں مدھو نے صرف اتنا کہا۔

"ارے بھائی مہنگا سنگھ! میں صرف چار کپ چائے پیوں گا اور چار انڈوں کا آملیٹ لوں گا۔" اور ہماری طرف اشارہ کر کے بولے "ان لوگوں سے پوچھ لو، انھیں کیا چاہئے۔"

"آپ کی شفقت، اور مہنگا سنگھ کی عنایت۔" میں نے آداب بجا لا کر کہا۔

چندن باڑی سے امرناتھ، دو تہائی حصہ اور رہ جاتا ہے اور مدھو شاید آگے جانے کو اسی وجہ سے تیار نہیں ہوا کہ لوٹتے لوٹتے اس کا دو تہائی حصہ راستے ہی میں نہ رہ جائے۔ اسکی وجہ سے ہمیں بھی واپس لوٹنا پڑا۔

مٹن کھانے والا لڑکا مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"بابو صاحب! کیا پیدل چلیں گے؟"

"ظاہر ہے ہوائی جہاز کا انتظام تو ہے نہیں۔"

"تو آؤ چلیں۔"

کرشن اس تجویز سے بہت خوش ہوا۔ ایک تو اسے گھوڑے کی سواری مل گئی، دوسرے پگ والی لڑکی کا ساتھ مل گیا اور تیسرے مجھ سے نجات۔

سردار صاحب سے باتیں کرتے راستہ کٹ گیا۔ انھوں نے مجھے بتلایا کہ

وہ سرگودھا کے رہنے والے تھے، اور آج کل امرتسر میں بیوپار کرتے تھے۔ ان کی بدقسمتی انھیں کشمیر کی سیر کو کھینچ لائی۔ کشمیر کے ایک شہر میں وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں کسی نے ان کے ٹرنک سے بہت سی چیزیں اڑا کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ وہ اس بات پر افسوس کرنے لگے۔ جب میں نے انھیں بتلایا کہ میرا بستر راستے میں کھو گیا ہے، ان کا سب غم جاتا رہا۔

باتوں باتوں میں ہم آدھے سے زیادہ راستہ طے کر گئے اور ندی کے موڑ پر رک کر، شہسواروں کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹہ بعد گھوڑے اپنے سواروں سمیت آ پہنچے۔ کمال فراخ دلی سے کرشن بھگوان نے گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں دے دی اور دس منٹ کے بعد مکمل سنجیدگی کے ساتھ چھڑی کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے چھڑی کا چارج سنبھالا، اور گھوڑے کا چارج دیا۔ تین میل تک حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ چھڑی میرے میرے ہاتھ میں رہی اور باگ رقیب کے۔ ہاں برف زیادہ پگھلنے کی وجہ سے نالے چڑھ آئے تھے۔ اور انہیں پار کرنے کے لئے مجھے پتلون کو اوپر چڑھانا اور جوتوں کو اتارنا پڑتا۔ اس مصیبت اور تنہائی میں علم دین سائیس کا ساتھ ہی مجھے گوناگوں تسلی بخش رہا تھا، کیونکہ سردار صاحب بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ علم دین کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ راستے میں پڑنے گاؤں میں کشمیری بچے یا تو میری سنجیدہ شکل دیکھ کر ڈر سے بھاگ نکلتے، یا علم دین سے باتیں کرتے دیکھ کر پیسے مانگتے۔ ان کے والدین اکڑ کر کھڑے رہتے، اور راہ گیروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ تکتے۔ بچوں کو پیسے دینے کے میں اصولاً خلاف تھا، کیونکہ جیب سے جاتا ہے اور منتر کہ گھوڑے نے میرا پارہ چڑھا رکھا تھا۔ ان بچوں کو نظر انداز کرتا ہوا میں چلتا چلا گیا۔ حسین قدرتی مناظر میرے لئے غیر دلکش بن گئے تھے، ندی کا نغمہ مجھے محظوظ کر رہا تھا، نہ دلکش سبزہ۔ ٹانگوں میں درد تھا، جسم میں درد تھا، دل میں درد تھا۔ زندگی میں ایک بار نہیں

دوبار مشترکہ بیوپار میں دھوکا کھا بیٹھا تھا۔ اب مشترکہ گھوڑے میں بھی مات کھائی۔ پیسے برابر کے گئے، گھوڑا رقیب کے قابو میں رہا۔

پہل گام سے آدھ میل دوری پر گھوڑا سوار میرا انتظار کر رہے تھے، اور قہقہے لگا رہے تھے، شاید اپنی جیت اور میری ہار کے۔ مجھے سنجیدہ مزاج دیکھ کر کرشن نے گھوڑے کی باگ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے چھڑی مانگنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کی اس حرکت کو ایک دم نظرانداز کر دیا۔ ہمدردی کے جذبے سے متحرک ہو کر یا مذاق کے جذبے سے، مدھو صاحب بولے۔

"تھک گئے ہو گے، گھوڑے پر بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟"

"خاموش رہنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔ ان کا مذاق، روپوش ہو گیا اور سنجیدگی تخ۔

مجھے اس حد تک سنجیدہ دیکھ کر وہ دونوں بھی گھوڑوں پر سے اتر پڑے۔ کرشن کو پیچھے دیکھ کر مدھو میرے کان میں بولا

"یہ شخص بڑا خودغرض ہے۔ میں نے اسے بار بار کہا کہ تمھیں بیٹھ لینے دے لیکن بولا کہ تمھیں پیدل چلنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔"

مدھو کا سانس جلدی پھول گیا اور وہ پیچھے رہ گیا۔ تب کرشن نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

"یہ مدھو بھی کیا عجیب شخص ہے۔ اس نے مجھے گھوڑے پر سے اترنے ہی نہیں دیا۔ اچھا کل گلیشیر پر چلیں گے۔"

"ایک شرط پر" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"مشترکہ گھوڑا نہیں لیں گے۔"

سر سے پاؤں تک کرشن کے جسم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

نئی راہ

سارا گاؤں بازار کے چوک میں جمع تھا۔ لوگ اپنے اپنے کام کاج چھوڑ کر چوک میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

زمینداروں نے رہٹ چلانے، کنائی کرنے اور رس پیڑنے کا کام روک دیا تھا۔ درزیوں کی دوکانیں بند تھیں۔ پنساریوں کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُن پر چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو بٹھا دیا گیا تھا اور دوکان دار خود چوک میں جا پہنچے تھے۔ مہاجنوں نے دوکانوں کے باہر بچھی ہوئی میلی اور پھٹی ہوئی دریوں کو لپیٹ کر اندر رکھا، حقوں کی چلموں میں نئی آگ بھری، کواڑ بھیڑ کر تالا لگایا اور حقے اُٹھا کر چوک میں آ بیٹھے۔ بھنگی تو اپنا کام کر ہی چکے تھے، گھروں میں بیٹھے رہنے کی بجائے، وہ بھی وہیں پہنچ گئے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے چمار بھی خالی ہی تھے۔ موچیوں نے بھی کام بند کر کے وہاں پہنچ جانا مناسب سمجھا۔ عورتیں بھی چھتوں پر آ بیٹھیں۔

آج بشن داس کی پنچائت کے سامنے پیشی تھی۔ چبوترے پر دری بچھا کر اس پر چاردن

پنچوں کو بٹھایا گیا تھا۔ وہیں ذرا پرے گاؤں کے "بڑے" بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ دور دوسروں سے ذرا ہٹ کر بھنگی بیٹھے تھے۔ یہ گواہ تھے، ملزم سامنے کھڑا تھا۔

مقدّمہ شروع ہوا، سرپنچ نے ملزم سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ تم نے کل رات مرگھٹ پر جاکر جلتی چتا پر سے لکڑیاں چرائیں ؟"

ملزم خاموش رہا۔

"ہماری بات کا جواب دو" سرپنچ نے کہا۔

مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"تم کہتے ہو" سرپنچ نے گواہوں کو مخاطب کیا "کہ ملزم نے کل رات مرگھٹ پر جاکر جلتی چتا کی لکڑیاں چُرائیں ؟"

گواہوں نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

"تمھارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے ؟"

"حجور" چار پانچ گواہ اکٹھے ہو کر بولنے لگے۔

"سب نہیں" ایک پنچ نے انھیں روکا "چندو! تم بتلاؤ"

"حجور" چندو بتلانے لگا۔

"کھڑے ہو کر جی" ایک اور پنچ نے اُسے ڈانٹا۔

چندو کھڑا ہو گیا اور بولا "حجور کل رات ہم سو رہے تھے۔ ایکا ایکی کتّوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سے ہماری آنکھ کھُل گئی۔ ہم سمجھے کوئی جناور ہے۔ لاٹھیاں لیکر باہر نکلے۔ دیکھا تو کتّے ایک آدمی پر بھونک رہے تھے۔ اندھیرے میں ہم اُس کو پہچان نہ سکے ......"

"کیا تمھارے پاس لالٹین نہیں تھی؟" سرپنچ نے پوچھا۔

"تھی کیوں نہیں ججور۔" مگر ہم سب آگے بڑھ گئے تھے اور تلسی جس کے پاس لالٹین تھی، وہ پیچھے رہ گیا تھا۔"

"پھر؟"

"ہم سمجھ گئے کہ یہ تو کچھ اور معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب چور کے پیچھے بھاگے، شاید وہ ہماری لاٹھیاں دیکھ کر ڈر گیا یا کتوں سے خوف کھا کر ایک دم رُک گیا۔ ہم نے اُسے پکڑ کے مُشکیں باندھ لیں۔ .... اتنے میں تلسی لالٹین لیے ہوئے آگیا۔ جب ہم نے روشنی میں اُس کی صورت دیکھی تو حیران رہ گئے۔ چور یہ بشن داس تھا اور یہ مرگھٹ کی جلتی چتا کی لکڑیاں چرا کر لے جا رہا تھا۔"

"بس؟"

"جی ججور۔"

"وہ لکڑیاں کہاں ہیں؟" ایک پنچ نے پوچھا۔

"یہ رہیں ججور۔" دُتے بھنگی نے لکڑیاں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

سب کی نظریں ان لکڑیوں پر جم گئیں۔ چھ سات لمبی لمبی ادھ جلی لکڑیاں تھیں۔ سب نے پہلے ان ادھ جلی لکڑیوں کی طرف دیکھا پھر بشن داس کی طرف، اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلانے لگے۔ ہر طرف سے "چچ چچ چچ" کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ ملزم کی طرف حقارت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں ——— بے بدذات! شرم نہیں آئی تجھے ایسا کام کرتے! تو نے گاؤں کا نام ڈبو دیا۔

پنچ آپس میں صلاح و مشورے کرنے لگے۔ دوسرے لوگ باتیں کرنے لگے۔

عورتوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی ــــــ

"دیکھنا بہن! اس موئے کو ایسا کرتے شرم بھی تو نا آئی"۔ بنتی بولی۔

"بہن کلجگ ہے کلجگ"۔ ہرّو لہارن نے کہا۔

"بھلا آج تک کبھی سننے میں آیا تھا؟" گجری سناری کہنے لگی۔

"پھٹکار ہے ایسے دُشٹ پر" کرمی مہری بولی۔

"خاموش!" سرپنچ کی آواز گونجی۔

"چپ ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ"۔ سب ایک دوسرے کو خاموش کرنے لگے۔ پل بھر میں سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔

"کیا تمہارے پاس اس الزام کا کوئی جواب ہے؟" سرپنچ نے ملزم سے پوچھا۔ ملزم اسی طرح خاموش رہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو۔ اور ہم اب اپنا فیصلہ سنا سکتے ہیں"

"نہیں!" مجمع میں سے ایک آواز آئی۔

سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ لوگ ذرا اونچے ہو ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کون بیچ میں کود پڑا۔ آخر یہ کیا دل لگی ہے! اس وقت ایسی فضول مسخری کا کیا موقع ہے!! یہ تو پنچایت کو بے عزت کرنا ہوا!!!

"یہ کس کی آواز ہے؟" سرپنچ کڑکا۔

"میری!"

سب لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے ــــ یہ تو رام چند ــــ

کیا اس جیسا سمجھدار اور لئے دئے رہنے والا آدمی بھی ایسی چھوٹی بات کر سکتا ہے۔ پنچائت کی توہین کرنا تو جرم ہوتا ہے !!!

پنچ پہلے تو ہکا بکا رہ گئے، پھر دفعتاً سنبھل گئے۔ رام چند کو گاؤں میں کون نہیں جانتا تھا؟ اس کی علمی قابلیت سے کون واقف نہ تھا؟ گاؤں کے لوگ اکثر اس سے صلاح ومشورے کرتے رہتے تھے اور ہر معاملے میں اُس کی بات مانی جاتی تھی۔ اس کی رائے میں وزن، دلیل میں جان اور خیالات میں توازن ہوتا تھا۔ اس کی بات کو ہنسی میں اُڑا دینا یا ٹال جانا ممکن نہ تھا۔ اس معاملے میں اس کی دخل اندازی کا بھی کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہوگا۔

سرپنچ نے رام چند کو مخاطب کر کے کہا: "بھگت جی! آپ کہتے ہیں کہ ہم ابھی فیصلہ نہیں سنا سکتے۔ گویا ملزم کو سزا دینے میں ابھی ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے؟"

"جی ہاں"، رام چند بولا "میں نے یہی کہا ہے۔"

"یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ گواہوں نے ملزم کے خلاف گواہی دی ہے اور اس کا جرم بھی ثابت ہوگیا ہے اور اس نے اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔"

"یہ سب تو میں بھی سُن رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں، مگر اسے سزا کا سبب بنانے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟ ضرورت کیوں نہیں؟" ایک پنچ بولا۔

"ابھی بتلاتا ہوں"، رام چند نے کہا "آپ پنچ ہیں، آپ نے ایک شخص پر چوری کا الزام لگایا، گواہوں نے اس کی تائید کی، جرم ثابت ہوگیا لیکن کیا آپ نے اس شخص کی نیت کو سمجھنے کی بھی کوشش کی؟"

"اس میں نیت کی کیا بات ہے؟" ایک پنچ نے پوچھا۔

"جرم کے ارتکاب میں ملزم کی نیت کو بہت اہمیت ہوتی ہے۔ قتل کے مقدمہ میں بھی اگر مجرم کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا پھر بھی ایسا ہو گیا تو عدالت اسے پھانسی کی سزا نہیں دیتی۔ موٹر ڈرائیور اتنے آدمیوں کو مار ڈالتے ہیں لیکن انھیں موت کی سزا نہیں دی جاتی، کیونکہ اُن کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں ہوتا۔ اسی طرح چوری کے مقدمہ میں بھی ہمیں نیت یا ارادہ کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ اب میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک ملزم کا ارادہ یا اس کی نیت کیا تھی؟"

"چوری۔ اور کیا؟" ایک پنچ بولا۔

"لیکن اُس نے چوری کیوں کی؟"

"عجیب سوال ہے۔" ایک دوسرے پنچ نے کہا۔ "یہ تو آپ ملزم سے پوچھئے۔"

"ملزم سے نہیں، میں تو آپ سے پوچھتا ہوں۔" رام چند بولا۔ "اُسے سزا تو آپ ہی دے رہے تھے نا؟"

"آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔" وہی پنچ کہنے لگا۔

"میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ جب ملزم مرگھٹ پر لکڑیاں چرانے گیا تو اُس نے لکڑیوں کی چوری کسی خاص ضرورت سے مجبور ہو کر کی یا محض چوری کے ارادے سے؟"

"اس کا جواب تو ملزم ہی دے سکتا ہے۔"

"ملزم کی طرف سے اس کا جواب میں دیتا ہوں۔" رام چند نے کہا "ملزم گاؤں بھر میں سب سے غریب آدمی ہے۔ وہ درزی کا کام کرتا ہے لیکن اس کو مشین تک میسر نہیں۔ اس کا باپ بھی غریب تھا۔ اور ایک غریب

باپ مرتے وقت اپنے بیٹے کے لئے، غریبی کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑ سکا ملزم کا سگا چچا امیر ہے۔ اس نے بھی شہر میں درزی کی دوکان کر رکھی ہے۔ اس کی یہ دوکان خوب چل رہی ہے۔ سنا گیا ہے کہ وہ بڑا دانی ہے۔ اور خیر خیرات کرتا رہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہر سال ہر دوار جاتا ہے تاکہ سال بھر کے پاپ گنگا مائی میں بہا آئے۔ وہ بڑے آدمیوں کو پارٹیاں بھی دیتا ہے۔ لیکن آج تک اُس نے اپنے بھتیجے اور اس کے بال بچوں کو پھوٹی کوڑی تک نہیں دی۔ گاؤں میں اور شہر میں یہ فرق ہوتا ہے کہ شہر میں ایک ہی محلے میں بسنے والے ایک دوسرے کے شریک درد ہونا تو کجا ایک دوسرے سے واقف تک نہیں ہوتے لیکن گاؤں ایک جسم کی طرح ہوتا ہے۔ ایک انگ کی تکلیف سے باقی سب انگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ لیکن آجکل کے زمانے میں اس جسم کا خون بھی سفید ہو گیا ہے۔ ایک انگ کو تکلیف میں دیکھکر باقی جسم پرواہ نہیں کرتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا بشن داس کی اس غربت کو دیکھ کر، ہم لوگوں کے دل ذرا بھی نہ پسیجتے؟ کیا ہم اس کڑاکے کی سردی میں اُس کے اور اس کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بچوں کے لئے ایندھن اور کپڑا مہیا کرنے کی بجائے اُس پر مقدمہ چلاتے؟ لکڑیاں چُرانے کا الزام اُس پر نہیں، گاؤں پر لگنا چاہئے۔ تم سب نے اسے سردی سے بچانے کے لئے کیا کیا؟"

"یہ ہمارا کام نہیں۔" ایک پنچ بولا۔

"اُس پر مقدمہ چلانا تمہارا کام ہے؟"

"یہ قانونی کارروائی ہے۔"

"شہر میں قانون کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے، گاؤں میں نہیں لیا جا سکتا۔

پُرانے زمانے میں گاؤں میں پنچایت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سارے گاؤں کا انتظام کرے۔ اس کا کام مجرموں کو سزا دینا نہیں، جرائم کا انسداد کرنا بھی تھا۔ محض سزا دینے سے جرم کبھی نہیں رُک سکتے۔ وہ تو جرم کی جڑوں کو کاٹنے ہی سے رک سکتے ہیں ہمیں گاؤں کو ایک خاندان سمجھ کر اس خاندان کے بچّوں کو مارنے پیٹنے، جُرمانہ کرنے یا جیل بھیجنے کی بجائے ان کی تکالیف دور کرنی چاہئیں۔"

"ہمارا کام تو فیصلے کرنا ہے۔" ایک پنچ بولا۔

"یہ غلط ہے، ہم نے آپ کو گاؤں کی حالت سدھارنے کے لئے پنچ بنایا ہے۔ بگاڑنے کے لئے نہیں!"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم مجرم کو سزا دے کر گاؤں کی حالت بگاڑ رہے ہیں؟"

"آپ بگاڑ ہی رہے ہیں کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ سزا دینے سے جُرم رُک جائیں گے۔

آپ بشن داس پر چالیس پچاس روپے جرمانہ کریں گے۔ اتنا جرمانہ اُس کی کئی پشتیں بھی ادا نہیں کر سکتیں۔ جرمانہ بھرنے کے لئے وہ چوری کرے گا، پکڑا گیا تو جیل میں سڑے گا۔ اُس کی عورت بچّوں کو پالنے کے لئے کسی کے گھر غلامی کرے گی یا اپنی عصمت بیچے گی۔ اس کے بچّے گلی گلی بھیک مانگتے پھریں گے، آپکے ایک غلط فیصلے سے گاؤں کا ایک خاندان تباہ ہو جائے گا۔ اوروں پر اس کا بُرا اثر پڑے گا اور آپ کہتے ہیں کہ آپ کچھ بگاڑ ہی نہیں رہے۔"

حاضرین رام چندر کی تائید میں سر ہلانے لگے۔ عورتوں نے کانا پھوسی شروع کی، وہ بشن داس سے ہمدردی ظاہر کرنے لگیں ——!

"ہُن! دیکھنا موئے بھائی کو!" رام کنور بولی۔ "آپ اچھا کھاتا پیتا ہے،

یہ نہیں کہ کبھی غریب بھائی کو بھی چار پیسے بھیج دے۔"

"ہاں بہن کلجگ ہے!" رُکمن اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر کہنے لگی۔ "ماں گاؤں میں گوبر اکٹھا کرتی پھرتی ہے، بھائی چوری کرتا ہے اور مُوا خود عیش کر رہا ہے۔"

"میں ہوتی تو ایسے بیٹے کو گولی مار دیتی۔" پرتاپی جلا ہی بولی۔

"میں ہوتی تو خون پی جاتی۔" را آمو نٹ کی گھر والی بولی۔

"اری بہن! بس کچھ نہ پوچھ۔ گھور کلجگ ہے۔" رام رکھی نے اس گفتگو کو ختم کرنے کے انداز سے کہنا شروع کیا۔

"خاموش!" سرپنچ نے اونچی آواز سے کہا۔

"چپ ہو جاؤ بھئی سب چپ ہو جاؤ۔" ایک شخص حاضرین کو خاموش کرنے کے لئے چلایا۔

حقہ کی گڑگڑاہٹ بند ہو گئی۔ بیڑی پینے والوں نے اپنی اپنی بیڑیاں بجھا کر باقی حصے کو کانوں میں لگا لیا یا پگڑیوں کے نیچے رکھ لیا۔ سب نے اکڑوں بیٹھ کر اپنی اپنی پگڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے ٹھیک کیا۔ کھانسنے والے جلدی جلدی کھانس لئے تاکہ بیچ میں کھانسنا نہ پڑے اور سب خاموشی سے پنچوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" سرپنچ نے رام چند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مَیں۔مَیں۔مَیں!" جیسے سرپنچ کو جواب ملا ہو۔ حاضرین کا غیر ذمہ دار حصہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟" سرپنچ نے چلا کر پوچھا۔

"مَیں۔مَیں۔مَیں۔"

"سنتی نہیں" وہ ایک کوٹھے کی چھت کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کون ہے یہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟" (اور جب معلوم ہو گیا کہ بچہ کس کا ہے تو) "اری خصم نوکھانی، او بنتو کی بچی (وہ اپنی لڑکی کو مخاطب کر رہا تھا) تجھ سے اپنے باپ کو چپ نہیں کیا جاتا۔ جا لے جا اسے یہاں سے۔ سُنتی نہیں؟"

بنتو بچے کو گود میں لے کر نیچے اُتر گئی۔

"موا کوڑھی، رنڈی چھوڑ نا، نانا کی طرح چلّا رہا ہے۔ اسے موت بھی تو نہیں آتی۔" اس کی آواز سر پنچ نے بھی سُنی مگر اُس وقت خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا

پھر خاموشی ہو گئی۔

"ہاں رام چند جی!" سر پنچ نے اپنی بات دُہرائی "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ چاہتا ہوں" رام چند نے کہا "کہ ہمیں بشن داس یا اس جیسے دوسرے آدمیوں کو سزا دینے کے بجائے مجرموں کی جڑیں کھودنی چاہئیں۔"

"کس طرح؟"

"میری رائے میں ہمیں بشن داس جیسے غریبوں کے لئے کام ڈھونڈنا چاہیئے۔ اگر کوشش کی جائے تو یہ کچھ مشکل نہیں۔ بڑے زمینداروں کے ساتھ انھیں کھیتی کے کام میں لگا کر اجرت دلائی جا سکتی ہے۔ یہ دکانداروں کے ساتھ جا کر شہر سے ان کا مال لانے میں مدد کر سکتے ہیں۔ اور بھی بہت سے کام ایسے ہیں جو ان بیکار لوگوں کو دلائے جا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمیں غریب فنڈ قائم کرنا ہوگا۔ اس میں ہر شخص فصل کے موقعہ پر اپنی حیثیت کے مطابق، پیسے یا اناج دے کر اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔ اس فنڈ کے انتظام کے لئے گاؤں کے سرکردہ منصف مزاج اور غریب پرور لوگوں کی

ایک کمیٹی ہونی چاہیے۔ اس کمیٹی کے ذمّے چار کام ہوں۔

(۱) پیسہ یا اناج جمع کرنا۔ (۲) اس کا انتظام کرنا۔

(۳) غریبوں کے لئے کام مہیا کرنا (۴) ضرورت کے وقت انھیں اور اُن کے خاندانوں کو مدد دینا۔"

"کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہوتا ہے" ایک پنچ نے کہا۔

"اگر ارادہ پکّا ہو تو کرنا بھی آسان ہے" رام چند بولا۔

"اچھا آپ تو صرف میاں بیوی ہیں۔ آپ کا خرچ بھی زیادہ نہیں، آپ اس غریب فنڈ میں کیا دیتے ہیں؟" ایک پنچ نے پوچھا۔

"آپ یہ نہ کہیں کہ میرا خرچ زیادہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے پندرہ آدمیوں کے خاندان سے ہم دو کا خرچ دوگنا ہو۔ (حاضرین قہقہے لگانے لگے۔ یہ پنچ اپنی کنجوسی کے لئے گاؤں بھر میں مشہور تھے) مگر غریب فنڈ کے لئے آپ مجھ سے چندہ مانگنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن اپنا چندہ دینے سے پہلے میں گاؤں کے مشہور نوجوان سیٹھ رنبیر کی طرف سے پانچ سو روپے حاضر کرتا ہوں" اور پانچ سو روپیہ کے نوٹ اس نے سرپنچ کے آگے پھینک دئے۔

تالیوں کی صدا سے آسمان گونج اُٹھا۔ لوگوں نے پنچوں کی طرف دیکھا۔ پنچوں نے پاس ہی دری پر بیٹھے ہوئے منوہر لال کی طرف دیکھا۔ منوہر لال نے اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بھائی رنبیر کی طرف دیکھا اور رنبیر نے رام چند کی طرف۔

منوہر لال جیسے رنبیر سے کہہ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم کے لئے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ رنبیر جیسے رام چند سے کہہ رہا تھا۔ یہ کیا غضب کر دیا؟ اور رام چند جیسے جواباً کہہ رہا تھا۔ کچھ فکر نہ کرو۔

"اور رام چند کی آواز پھر بلند ہوئی (ایک دم خاموشی چھا گئی) "اپنی طرف سے تین سو روپئے حاضر کرتا ہوں۔" اور اس نے دس دس روپے کے نوٹ سرپنچ کے سامنے ڈال دیے۔

تالیوں کی آواز پھر گونجی۔ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ غریب غریب کے خلاف ہی گواہی دینے آئے! بھوکے کا دشمن بھوکا۔ گندگی اٹھا کر بھی روٹی سے محتاج رہنے والے ایک دوسرے شخص کو جو بھوک سے نڈھال، اور سردی سے پریشان ہے مجرم ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں! اور پنچ جنہیں گاؤں کے لوگوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے پہرے دار مقرر کیا ہے، اس گاؤں کے ایک غریب کی تکلیف کو دور کرنے کی بجائے، اُس کو سزا دے رہے ہیں! لعنت ہے ان سب پر!

روپے کی بارش ہونے لگی۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب نے چندہ دینا شروع کر دیا۔

حجور!" چندو بھنگی دونوں ہاتھ جوڑے پنچایت کو مخاطب کر رہا تھا "ہم اپنے کئے پر شرمندہ ہیں۔"

"تم لوگوں نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔" رام چند نے کہا "تم نے اپنی ڈیوٹی بجائی۔"

منشی بھنگی اُٹھ کر بولا "نہیں حجور، ہمیں دُکھ ہے کہ ہم نے اپنے جیسے ایک گریب بھائی کے کھلاپھ گواہی دی۔ ہم سب بھی گریب پھنڈ میں آٹھ آٹھ آنے جمع کرتے ہیں۔" اُس نے دو روپے آگے بڑھا دیے۔

لوگوں نے تالیوں سے اس پیشکش کا سواگت کیا۔ عورتوں نے دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں ـــــ بشن داس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

انٹرویو

"نمستے منشی جی!" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔
نمستے!
"میں اِنٹرویو کے لئے آیا ہوں!"
"تشریف رکھئے۔" اُنھوں نے میری طرف نگاہ اُٹھائے بغیر کہا۔
وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ اُن کے سامنے میز پر فائلوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ اور فرش پر بھی۔ دیواروں کے ساتھ بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ جن میں اے آئی۔ آر کی موٹی موٹی جلدیں رکھی تھیں۔ ایک ایڈوکیٹ کے کمرے میں اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ پھر رائے بہادر دُرگا داس تو شہر کے چوٹی کے وکیلوں میں سے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے منشی جی کے چہرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اگر میرے ساتھ کوئی میرا دوست ہوتا تو منشی جی کی شکل دیکھ کر ہنسی کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ دبلے پتلے جسم پر ایک چھوٹا سا چہرہ تھا جس پر سب سے زیادہ نمایاں اُن کی پلی ہوئی مونچھیں تھیں۔ اُسترے سے صاف کئے ہوئے سر کے بیچ میں بالوں کا ایک گھنا گچھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چٹیل میدان میں ایک جھاڑی۔ لکھنا بند کر کے منشی جی اپنی کرسی پر سے اُٹھے۔ اور

مجھ سے کچھ کہے بغیر چلے گئے - رائے بہادر سے میری اطلاع کرنے - میں نے سوچا - شہر کے ایک کامیاب اور چوٹی کے وکیل ہونے کے ناتے اور سماجی اور تعلیمی کاموں میں دلچسپی لینے کے سبب، رائے بہادر درگا داس کئی دوسرے اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ، رام داس کالج فار گرلز کی مینیجنگ کمیٹی کے چیرمین تھے - اور ان کے بنگلے پر ہی آج کالج کے لئے ہسٹری کے پروفیسر کا انتخاب ہونا تھا۔ ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے کئی ماہ بعد تک سڑکوں کی خاک چھانتے اور دفتروں کے دروازے کھٹکھٹاتے میں تنگ آچکا تھا انگریزی اخباروں کے وانٹیڈ کالمز کے جواب میں عرضیاں دے دے کر، اپنا جو تھوڑا بہت اثاثہ تھا، ختم کر چکا تھا۔ کسی بھی کالج میں پارٹ ٹائم جگہ حاصل کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ رام داس کالج فار گرلز میں کچھ دن کام کرنے کے بعد لڑکوں کے کسی کالج میں جگہ حاصل کر سکوں گا اس کی مجھے امید تھی۔ اگرچہ دی۔ ڈی اگروال اور رام سروپ بھٹناگر اس کالج میں کئی سال سے پڑھانے کے باوجود اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ وہ کالج میں تو محض سو سو روپے پاتے تھے۔ لیکن پرائیویٹ ٹیوشن سے چار چار سو کماتے۔

بیسیوں درخواستیں دینے کے بعد، دو دن پہلے رام داس کالج فار گرلز کے سکریٹری کی طرف سے انٹرویو کا خط پا کر میں ناچ اٹھا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر اداسی چھا گئی تھی۔ انٹرویو کے لئے سوٹ کا کیا ہوگا ——؟ میرا اپنا سوٹ راجیندر اپنے ماموں زاد بھائی کی شادی میں شامل ہونے کے لئے لے گیا تھا۔ قمیض، پاجامہ، دھوتی یا نیکر پہن کر انٹرویو میں نہیں جا سکتا تھا۔ نیا سوٹ دو دن میں سل سکتا تھا۔ لیکن پیسے نہیں تھے۔ دوستوں میں کوئی ایسا نظر نہیں آرہا تھا جس سے سوٹ مانگ سکوں۔ ان میں سے اکثریت بلا فیس دیئے، خیراتی کالجوں میں پڑھنے والوں کی تھی۔ گرم سوٹ تو درکنار، ان سے سوتی

واسکٹ ملنے کی بھی امید نہ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ روشن لال نے آنے جانے کے لئے ایک سوٹ بنوا رکھا ہے۔ دراصل بنوایا نہیں، کباڑی کی دُوکان سے خرید کر، اسے رنگوا لیا ہے۔ اگرچہ اس کا سوٹ میرے پوری طرح نہیں آتا تھا۔ لیکن کام چلانے کے لئے برا نہیں تھا۔

روشن لال کا سوٹ اور ہیٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر، جوتوں پر پالش کر دا، اور راجیندر کا فاؤنٹین پین لگا کر میں یہاں انٹرویو کے لئے پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ انٹرویو کے لئے آ گئے۔ انھیں دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت کا احساس ہوا۔ ان میں سے اکثر کے چہروں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گرلز کالج میں پروفیسری کیلئے نہیں، ودھوا آشرم کے لئے بھیک مانگنے آئے ہیں۔ اُن میں سے صرف ایک شخص سوٹ پہنے تھا اور وہ بھی سوتی۔ ایک صاحب بند گلے کا سوٹ پہنے تھے۔ ایک کھادی کی دھوتی کُرتے میں ملبوس تھے۔ اور ایک قمیص پاجامہ اور چھوٹا کوٹ پہنے تھے۔

چپراسی نے میرا نام پکارا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیوں کے اسکول کا یہ چپراسی، رائے بہادر کے منشی سے کئی گنا زیادہ باوقار تھا۔ لیکن یہ موازنے کا وقت نہیں تھا۔ انٹرویو روم کے پاس پہنچ کر چپراسی نے چک اُٹھائی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اگر میں جلدی سے کرسی کا سہارا نہ لے لیتا تو میرے گر پڑنے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ میرے بالکل سامنے چیرمین کی کرسی پر وہی صاحب بیٹھے تھے جنھیں میں نہ صرف منشی جی سمجھا ہی تھا بلکہ منشی جی کہہ کر مخاطب بھی ہوا تھا۔ یہی تھے رائے بہادر درگا داس رام داس گرلز کالج کی مینجنگ کمیٹی کے چیرمین ـــ! مجھے اس طرح گھبرائے ہوئے دیکھ کر رائے صاحب بولے ـــ

"کیا طبیعت ٹھیک نہیں ؟"

"ہاں ذرا سر چکرا گیا تھا"

"ابھی سے؟" بائیں طرف سے ایک مہین آواز آئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو سفید ریشمی ساری پہنے، چشمہ لگائے ایک خاتون کو کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ یہ تھیں کالج کی پرنسپل مس نارائن۔

"آج کل کے نوجوانوں کو یہ عام بیماری ہے"۔ دائیں طرف میرے کان میں آواز آئی۔

میں نے دیکھا، بے حد چھوٹے قد اور چھوٹی مونچھوں والے ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ جو متوجہ تو مجھ ہو رہے ہیں لیکن رائے بہادر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی تھے اور بھینگے بھی۔

میں اتنا گھبرا گیا کہ کچھ سیکنڈ تک فیصلہ نہ کر سکا کہ کھڑا رہوں یا بیٹھ جاؤں۔

"تشریف رکھئے!" چیرمین صاحب بولے۔

"تھینک یو" اپنی ہیٹ میز پر رکھ کر، اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا تبھی اچانک مجھے کچھ سوجھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں اپنی سیٹ پر سے اٹھا، اور رائے بہادر کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا ——

"نمستے"

"نمستے!" وہ مسکرا کر بولے۔

پھر میں نے پرنسپل اور دوسرے صاحب کو بھی اسی طرح نمستے کی۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں ایکٹنگ خوب رہی۔

"تو مسٹر پرکاش!" رائے بہادر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔۔۔" آپ نے ایم۔اے کب پاس کیا؟"

"اسی سال۔"

"کس مضمون میں؟"

"ہسٹری میں۔"

"ہسٹری ہی میں کیوں؟" پرنسپل بولیں۔

"اچھی لگتی ہے!"

"کون؟"

"ہسٹری۔"

"اور پالٹیکس؟"

"اس سے گھبراتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"شرافت کا یہی تقاضا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے پالٹیکل سائنس!" مس نارائن اپنے سوال کو واضح کرتی ہوئی بولیں۔ "ہسٹری اور پالٹیکل سائنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آج کل لوگ ڈبل ایم۔اے پاس کرتے ہیں۔"

"ہمت والے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مرد ہو کر آپ میں ہمت نہیں؟!" کماری جی طنزاً بولیں۔ "میں عورت ہوں۔ چار مضامین میں ایم۔اے ہوں۔ بی ٹی اور ایل۔ایل بی بھی۔"

"اور آپ میں ہمت نہیں۔" ناٹا گردن ہلا کر کہنے لگا۔

"صاحب، ایک سے زیادہ ایم۔اے کرنے کے میں خلاف ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس سے آدمی کند ذہن ہو جاتا ہے۔"

"شٹ آپ!" ناٹا اپنی کرسی پر سے اچھل کر بولا۔

"آج کل کے پڑھے لکھوں کو بات تک کرنے کا شعور نہیں۔" مس نارائن چشمہ اتار کر اسے رومال سے پونچھتی ہوئی بولیں۔

"اچھا یہ بتائیے۔" رائے صاحب شاید بات بدلنے کے خیال سے بولے "آپ نے ہسٹری کیوں لی؟"

"صاحب اس لئے کہ..... بس اس لئے...... کر لی۔"

"لیکن کیوں؟"

کیونکہ اکنامکس آتی نہیں تھی۔ انگریزی مشکل معلوم ہوتی تھی۔ پالیٹکس میں دلچسپی نہیں۔"

"ہسٹری میں ہے؟"

"جی!"

تو بتائیے۔" مس نارائن نے پوچھا۔ "نورجہاں شیر افگن سے پیار کرتی تھی، یا جہانگیر سے؟"

"پہلے شیر افگن سے بعد میں جہانگیر سے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتائیے۔" رائے صاحب بولے۔ "الزبتھ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اب صاحب! یہ تو وہ جانے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن کچھ عورتوں کے لئے ایک آدمی کا انتخاب بھی تو مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسی بیسیوں مثالیں ہیں جب

چالیس سال کی ہو جانے پر بھی عورتیں شادی نہیں کرتیں۔" میں نے مس نارائن کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پرنسپل کا چہرہ سرخ ہو گیا، شرم سے، یا غصّے سے چھوٹتے ہی بولیں۔

"کیوں صاحب! یہ بتایئے ٹوڈرمل کی بیوی ناشتے میں کیا کھاتی تھیں؟"

میں نے محسوس کیا جیسے کسی نے سر پر ڈنڈا مارا ہو۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا اور الٹا ان سے پوچھ بیٹھا ——

"کون سی بیوی؟"

اب پرنسپل کے گھبرانے کی باری تھی۔ بولیں ——

"دوسری۔"

"لیکن اس کی تو شادی کے فوراً ہی بعد موت ہو گئی تھی!" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک! یہی پوچھنا چاہتی تھی۔" مس نارائن اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے بولیں۔

اب سوال کرنے کی باری ناٹے کی تھی۔ بولے ——

"مسٹر پرکاش! یہ بتایئے کہ رضیہ یاقوت سے محبت کرتی تھی؟"

"صاحب! اس کا صحیح جواب تو رضیہ ہی دے سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن دل اور شادی کے معاملے میں شکل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر جناب کا اشارہ یاقوت کے حبشی ہونے کی طرف ہے ——"

"تمہارا شادی کے متعلق کیا خیال ہے؟" ہسٹری سے سوشیولوجی کی طرف آتے ہوئے ناٹے صاحب نے پوچھا۔

"کوئی برا خیال نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کیا تم شادی میں محبت کو جائز سمجھتے ہو؟"

"صاحب، بالکل! اور شادی کے بغیر محبت کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی ہے؟"

اب مجھے غصہ آنا لازمی تھا۔ کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ جس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ میں نے غصے کو دباتے ہوئے کہا ـــــ

"صاحب کرنے کی سوچ رہا ہوں۔"

"کب؟"

"نوکری ملنے کے بعد!"

"نوکری ملنے کے بعد!!" پرنسپل صاحبہ جیسے ہوا میں اچھلتی ہوئی بولیں "آپ کا مطلب ہے کہ آپ کالج میں آ کر یہ کام کریں گے؟ ناممکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا! سنا راے بہادر آپ نے؟!"

میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب......"

"مطلب میں سب سمجھتی ہوں۔" وہ اسی طرح غصے میں بولیں "آپ نے ابھی تک اس لئے شادی نہیں کی کہ کالج میں آ کر کریں گے۔ خوب!"

"لیکن......"

لیکن آپ کو اس بات کا پتہ ہونا چاہیئے۔" رائے بہادر بیچ ہی میں ٹوک کر بولے۔
"لڑکیوں کے کالج میں ایک کنوارے شخص کو کیسے لیا جا سکتا ہے۔"

"پھر جو اتنا نوجوان ہو!" تاتا بولا

"اور اتنا خوش پوش!" پرنسپل نے کہا "سوٹ تو دیکھئے کتنا خوبصورت ہے۔"
جیسے میرے سر پر ہتھوڑا پڑا ہو ـــــ 'خوبصورت سوٹ' ـــــ میں نے دل میں کہا۔

"ہاں!" ناٹے صاحب پرنسپل کی طرف دیکھنے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔
"لڑکیوں کے کالج میں آپ ایسا خوبصورت سوٹ پہن کر آئیں گے؟"
"نہیں صاحب۔ یہ سوٹ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوٹ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں ایک دم رک گیا۔
"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"میں کالج کے لئے سوٹ رنگواؤنگا نہیں۔"
وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے اُنھیں میرے پاگل پن پر پورا یقین ہو گیا ہو۔
"آپ اتنے فیشن پرست کیوں ہیں؟" مس نارائن نے پوچھا۔
"کالج میں آنے کے بعد فیشن چھوڑ دونگا۔"
"تو مسٹر پرکاش!" رائے بہادر دائیں ہاتھ کی پنسل سے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو بجاتے ہوئے بولے۔" آپ کتنی تنخواہ لیں گے؟"
"کتنی؟!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔—"جتنی اشتہار میں درج تھی۔"
"اشتہار کی بات چھوڑیئے۔ یہاں یہ رواج ہے کہ آپ کو ہر ماہ پچاس روپے کالج کو دان دینے ہوں گے۔"
"دان! پچاس روپے ماہوار! چھ سو روپے سال! اتنا دان تو رائے بہادر، لکھ پتی بھی نہیں دے سکتے۔" میں نے قدرے مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"در اصل یہ دان نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم پچاس روپے تنخواہ دیتے ہیں اور کاغذ پر سو روپے دکھاتے ہیں۔ تاکہ ہمیں گرانٹ ملتی رہے۔"
میرے جی میں آیا کہ میز پر پڑا شیشے کا پیپر ویٹ رائے بہادر کے منہ پر

دے ماروں اور ان کی مونچھوں کو نوچ ڈالوں۔ لیکن دماغ نے دل کو سمجھایا کہ ایسا کرنے سے فائدہ کچھ نہیں۔ نقصان بیحد ہوگا۔ پھر مجھے بیکاری کے دن آنکھوں کے سامنے گھومتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ ہوٹل کا چار ماہ کا بل، دھوبی کے پیسے، دوستوں کا اُدھار۔ میں نے دل پر جبر کر کے اور چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بالکل معقول بات ہے۔ تعلیمی ادارے کو دان دینے سے بڑھ کر اور کیا پُن ہو سکتا ہے؟"

لیکن میرے لئے ایک اور مصیبت تھی۔ رائے بہادر بہت شانتی اور کمال اطمینان سے کہنے لگے۔ جیسے کچھ بات ہی نہ ہو ــــــ

"دوسری بات یہ ہے کہ گرمیوں کی چھٹی کی تنخواہ نہیں ملے گی۔"

"نہیں ملے گی!" میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا یہ بھی دان میں شامل ہوگی؟"

"ہاں!"

"منظور۔ لیکن کیا کچھ نقد بھی دینا ہوگا؟"

"اپنی جیب سے نہیں۔" رائے بہادر نے جواب دیا۔

"دوسروں کی جیب سے کیسے دے سکتا ہوں؟"

"دان مانگ کر۔"

"تو مجھے بھیک بھی مانگنی ہوگی۔"

"اپنے لئے نہیں ـــ اور ودیا کے لئے بھیک مانگنا پُن کا کام ہے۔"

"اگر اس کے بجائے جیب سے نقد دے کر پُن کمانا چاہوں تو کتنے روپے مہینے

کے دے کر نپڈ چھوٹ سکتا ہے؟"

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں کیں۔ پھر رائے بہادر صاحب بولے ـــــ

"پانچ روپے۔ اس صورت میں آپ کو پینتالیس ملیں گے۔"

"منظور!"

"آپ کو اپنے کام کے بارے میں تو معلوم ہو گا؟" پرنسپل نے پوچھا۔
"کیا ہسٹری پڑھانے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا ہو گا؟"

"ہاں۔ ہسٹری کے اٹھارہ پیریڈز کے علاوہ چھ سوکس کے، چھ پالیٹکس کے اور چھ انگریزی کے پیریڈ لینے ہوں گے۔"

"انگریزی کے؟ انگریزی تو میں نہیں پڑھا سکتا۔"

"کیوں؟"
ناٹے صاحب میری طرف دیکھ کر اور دیوار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے ـــــ
"کیا آپ نے ہسٹری کا ایم۔اے یونانی زبان میں پاس کیا ہے؟"
"لیکن انگریزی تو وہی پڑھا سکتا ہے جو انگریزی کا ایم۔ اے ہو ـــــ" میں نے کہا۔
"مسٹر، سکنے کی بات تو چھوڑیئے۔ رائے بہادر بولے۔ دراصل ضرورت تو ایسے آدمی کی ہے جو یہ سب مضامین پڑھا سکے۔"

"لیکن اخبار میں تو اس کا ذکر نہیں تھا۔"

"سب باتیں اخبار میں کیسے آسکتی ہیں ـــــ تو آپ کو نہیں منظور؟"
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ پھر وہی سڑکوں کی پیمائش،

بے کاری کے دن۔۔۔۔۔"

"منظور! صاحب بالکل منظور! میں ہفتے میں چھتیس پیریڈ پڑھاؤں گا۔ اور اس کے علاوہ انگریزی بھی"۔

"اور تین پیریڈ صرف ایکنامکس کے"۔ پرنسپل نے کہا۔

"لیکن ایکنامکس تو میں نے صرف بی۔اے تک پڑھی ہے"۔

"اور یہاں کون ایم۔اے کو پڑھانے کو کہتا ہے۔ آپ صرف ایف۔اے کو ایکنامکس پڑھائیں گے۔ تیاری کرکے آدمی کیا نہیں پڑھا سکتا؟ پروفیسر ڈی۔ڈی تو تیاری کرکے لا کے کلاسوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ اور آپ انٹر کو ایکنامکس نہیں پڑھا سکیں گے؟"

"نہیں صاحب ضرور پڑھا سکوں گا"۔ میں نے گلے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ" ـــــ ناٹا ایک آنکھ سے چیرمین، دوسری آنکھ سے پرنسپل کو دیکھ کر، میری طرف انگلی اُٹھا کر بولا۔

"آپ کو ہر ماہ لڑکیوں کی فیس وصول کرکے بینک میں جمع کرانی ہوگی۔ اور فیسوں کے متعلق سب اکاؤنٹ رکھنے ہوں گے"۔

"سکریٹری صاحب!" رائے بہادر بولے ـــــ "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ ایسے معمولی کام تو چلتے ہی رہتے ہیں"۔

"لیکن صاحب! میرا حساب کمزور ہے۔ فیسوں میں گڑبڑی نہ ہو"۔

"آپ کا کیا مضبوط ہے؟" پرنسپل عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے، میری طرف گھور کر بولیں۔ "انگریزی آتی نہیں، ایکنامکس پڑھا نہیں سکتے، فیس وصول

کرنے میں گڑبڑ ہوگی۔ آخر آپ نے ایم۔ اے میں کیا پڑھا ہے؟"

"تاریخ!" میں نے کہا۔

"مسٹر!" ناٹا بولا ــــ "آپ عجیب وغریب جواب دے رہے ہیں۔ آپ کیا کھا کر آئے ہیں؟"

"توس اور آملیٹ" میں نے فوراً جواب دیا۔ کیونکہ پروفیسر جوہری نے بتایا تھا کہ انٹرویو میں فوراً جواب دینا چاہئے۔ چاہے غلط ہی ہو۔ اگرچہ میں محض چائے کا ایک کپ پی کر آیا تھا۔ لیکن رعب ڈالنے کے خیال سے ایسا کہہ دیا۔ یہ جواب سن کر ناٹے کے چہرے پر غصّے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ بولے ــــ

"لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے والوں کو آملیٹ یا اس قسم کی خوراک نہیں کھانی ہوگی!"

"آئندہ نہیں کھاؤں گا"

"ایک بات اور ــــ" مس نارائن بولیں۔

دل کو کڑا کر کے میں نیا وار سہنے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ کو رائے بہادر کی لڑکی کو ایک گھنٹہ روز پڑھانا ہوگا۔ وہ اس سال بی۔ اے کا امتحان دے رہی ہے"

"کہاں پڑھانا ہوگا؟"

"گھر پر"

"گھر تو......."

"ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ یہی نا؟" ناٹے صاحب بولے۔ "تو کیا ہو گیا۔ سات

ہی میل کا فاصلہ تو ہے۔ سیر ہو جائے گی۔ نہیں تو سائیکل پر چلے جانا۔"

"صاحب سائیکل تو میرے پاس ہے نہیں۔"

"تو کیا موٹر سائیکل ہے؟" ناٹا طنزاً بولا۔ "بس ہیں چلے جانا۔"

"اس میں تو پیسے لگیں گے۔"

"تو اور کیا مفت لے جائیں گے؟ ہا ہا ہا!" ناٹا میری بات کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "ارے میاں کتنے پیسے لگیں گے؟ دو چار آنے ہی نا؟ تم جیسے نوجوان اس سے دگنے پیسے سگریٹ اور پان میں اڑا دیتے ہیں۔"

"لیکن میں نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ پان کھاتا ہوں۔"

"ہم آپ سے یہ نہیں پوچھ رہے کہ آپ کیا، اور کب کھاتے ہیں۔ سیدھا سا جواب دیجئے کہ آپ کو منظور ہے یا نہیں؟"

"منظور صاحب! بالکل منظور!" میں نے فوراً کہا۔

"تو ٹھیک ہے، آپ جا سکتے ہیں۔" رائے بہادر بولے۔ "اور آپ آج ہی سے کالج میں کام شروع کر دیجئے۔"

"صاحب! آج ہی سے؟"

"اور کب سے؟" سکریٹری نے مجھے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی تیاری نہیں ہوگی؟"

"نہیں صاحب! میرا سوٹ۔۔۔۔"

"ہاں، آپ کا سوٹ اتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہئے۔ آپ بالکل معمولی سوٹ پہن کر آیئے۔ دوسرے خوبصورت بننے کی کوشش مت کیجئے۔ بال، سال میں دو یا تین مرتبہ کٹوایئے۔ اور ہو سکے تو صرف تعطیلات میں۔ کریم اور سرمہ بالکل مت لگایئے۔ کالج میں لڑکیوں

سے بات کرتے وقت نیچی نگاہ رکھئے بھول کر بھی مسکرایئے نہیں۔ نہ اکیلی کسی لڑکی سے بات کیجئے۔"

"کسی پروفیسر سے؟"

"لیڈی پروفیسر سے بھی نہیں۔" ناٹے نے کہا۔

"صاحب! میں نے سکریٹری کی طرف دیکھ کر پوچھا ـــــ "آپ کی لڑکی کس کلاس میں پڑھتی ہے؟"

"آپ کو اس سے مطلب؟" وہ آنکھوں میں سارا غصہ سمیٹ کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ اُسے بھی ۔۔۔۔"

"کیا اُسے بھی؟؟" وہ پوری شدت سے دائیں ہاتھ کا مکّہ میز پر مار کر بولا۔ لیکن اس کا اثر میری بجائے دوات پر ہوا۔ اور اس کی سیاہی اچھل کر اُن کے منھ پر جا رہی۔ انہوں نے ہاتھ سے ان چھینٹوں کو پونچھا۔ ہاتھ کو رنگا ہوا دیکھ کر وہ غصے سے نیلے اور پیلے ہوگئے۔

"آپ فوراً تشریف لے جایئے!"

وہ مجھے ڈانٹ کر بولے۔

میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھا۔ تینوں کو نمستے کر، ہاتھ میں میز پر رکھی ہوئی ہیٹ لے، کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

"مسٹر!" سکریٹری صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی ـــــ "آپ میری ہیٹ لئے جا رہے ہیں۔"

میں واپس لوٹا۔ ان کی ہیٹ کو میز پر رکھا۔ روشن لال والی ہیٹ کو اُٹھایا۔ اور جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل آیا۔

آشا دیپ

"کس خیال میں غرق بیٹھی ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"کسی کو اس سے کیا غرض!" ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے، دوسری طرف کا منہ کر کے وہ بولی۔

"اس سے نہیں۔" وہ ٹھوڑی کو چھو کر کہنے لگا۔ "خیال سے تو غرض ہے، تمھارے خیال سے۔"

"کسی کو کوئی حق نہیں کہ ہمارے خیالات میں مخل ہو۔" وہ اپنی مُسکراہٹ روکتے ہوئے بولی۔

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"یہ کیوں؟" وہ اچانک گھبرا گئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں، مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

"کیا بیت رہی ہے؟"

"تم نہیں جانتیں؟"

"میں کیا جانوں؟" وہ سانس روک کر بولی۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ تم کیا جانو۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ مگر وہ اُسی طرح بیٹھا رہا جیسے اس ہنسی نے اس پر کچھ بھی اثر نہیں کیا۔

"آج ہم شوٹنگ دیکھنے چلیں گے۔" وہ دفعتاً بولی جیسے اسے اَچانک کچھ سوجھی ہو۔

ایک پکچر بن رہی تھی۔ پلاٹ تھا وہی جو اکثر ہوتا ہے، جو زندگی میں نہیں ہوتا۔

شوٹنگ دیکھنے، وہ کہنے لگا "شکر ہے ہم فلم ایکٹر نہیں بنائے گئے۔"

"ہم فلم ایکٹر کیوں بنیں؟" وہ بولی "ہم زندگی کے ایکٹر بنیں گے۔"

"کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم زندگی کے ایکٹر بنیں گے۔ فلمی تصویروں میں تو ہر بات حقیقت کے برعکس ہوتی ہے۔ ایک ایکٹریس ہر پکچر میں نئے ایکٹر سے محبت ظاہر کرتی ہے۔ اُس کی محبت چند لمحوں سے زیادہ زندہ نہیں رہتی۔"

"مگر ہماری محبت لازوال ہوگی۔" وہ دور فضا میں سنہری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بیشک۔" وہ بولا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں تک تو میں تمھارا ہم نوا ہوں۔ مگر......"

"مگر کیا؟"

"جب تم اس سے آگے بڑھ کر شادی کو محبت کے لئے لازمی قرار دیتی ہو تو......" وہ مسکراتا ہوا اُٹھ گیا۔

"آج میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔" ایک دن وہ بولی۔

"اگر جواب نہ چاہو تو پوچھ سکتی ہو۔"

"تم ہمیشہ یوں ہی ٹال دیتے ہو۔"

"اور آج بھی ٹالنا چاہتا ہوں۔"

"وجہ؟"

"کچھ بھی ہو۔"

"لیکن یہ مناسب نہیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

"تم اتنے سنگ دل کیوں ہو؟" وہ ڈبڈبائی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ "یہ بات عام ہو چکی ہے کہ میں اور تم ایک دوسرے پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہے۔ میرے اور تمہارے والدین بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ رضامند ہیں۔ میرے تمہارے درمیان اب کوئی روک حائل نہیں۔ مگر......"

"میں روک بنا ہوا ہوں۔ تمہارا مطلب یہی ہے نا؟"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "لیکن تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"مجھے حُسن اور عشق کی توہین گوارا نہیں۔ شادی کے بعد نہ میرے دل میں یہ تڑپ رہے گی، نہ تمہاری آنکھوں میں یہ جادو رہے گا۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔"

"لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہماری زندگی میں بھی ایسا ہی ہو؟"

"ضرور ہو گا۔" وہ بولا۔ "یہ ناگزیر ہے، اٹل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا کرے تو زندگی کا نام زندگی نہ ہو۔"

وہ حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"میری محبت میں دوام ہے" وہ کہنے لگا "ناپائداری نہیں۔ اس میں زوال آتے ہی میری مسرت لٹ جائیگی، اور مجھے اس کے تصور سے بھی نفرت ہے۔"

"میں مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم مطلب نکالنا چاہتی ہو۔ ہر بات کا مطلب کیوں نکالا کرتی ہو؟ چھوڑو اس قصے کو کوئی اور بات کرو۔"

"تو گویا......"

وہ آنچل میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگی۔

"آج میرے دل میں تمھارے متعلق ایک عجیب و غریب خیال پیدا ہوا۔" وہ کچھ دیر بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟" وہ پوچھنے لگا۔

"یہی کہ تمھیں اپنے حسن اور قابلیت پر گھمنڈ ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسکی تردید ہو گئی۔"

"کہ نہیں ہے۔ لیکن تمھیں یہ بتایا کس مور کھ نے کہ نہیں ہے؟"

اس اشارے سے وہ شرما گئی۔ پھر پوچھنے لگی "کیا ہم ہمیشہ اسی طرح نہیں رہ سکتے؟"

"اس زندگی میں تو مشکل ہے۔"

"مرنے کے بعد؟"

"شاید ممکن ہو۔"

"تو چلو مر جائیں۔"

وہ ہنس پڑا "زندگی اور موت پر ہمارا اتنا زیادہ بس نہیں۔"

"خیال کر لو تم کہ ہے۔" وہ پھر ہنس پڑا۔

"آخر تمھیں کس طرح جیتوں؟" وہ تلملا اٹھی۔

"کیا تمھیں اپنی جیت میں شک ہے؟"

"تم اپنی ہار مانتے ہو؟"

"بالکل۔"

"تو پھر شادی......"

"لیکن ہار دل سے ہوتی ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولا۔ "جسم سے نہیں۔ دل تمھارا ہے، مرتے دم تک تمھارا رہے گا اور شاید اس کے بعد بھی۔"

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"شاید تم میری حالت کو نہیں سمجھتیں۔" وہ کہنے لگا۔ "تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں تمھارے سوا اور کوئی نہیں ہے، نہ کبھی ہوگا۔ میں تمھاری محبت کو زندہ رکھنے کا بیڑا اٹھا چکا ہوں۔ میں اس آگ کو سلگائے رکھنا چاہتا ہوں۔ شادی کے بعد یہ آگ سرد ہو جائے گی۔ میرے نزدیک وہ میری موت ہوگی، اور میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کسی اور مرد کے ساتھ میری شادی ہو جانے کے بعد تمھارا مجھ پر کیا حق رہے گا؟"

"حق ہی تو میں رکھنا نہیں چاہتا۔ تمھیں پا لینے کے بعد میرے لئے اور قابلِ حصول رہ ہی کیا جائے گا؟ میں تمھیں آدرش بنائے رکھنا چاہتا ہوں۔"

اپنی شادی کے دن، خوبصورت کپڑوں اور گہنوں میں ملبوس ہو کر اُس نے آئینہ دیکھا تو خود کو پہچان نہ سکی۔ اُس نے دل میں کہا۔ بڑے نازاں تھے اپنے حُسن پر۔ آج سامنے آئیں تو کھلی مات دے دوں۔ وہ اس کے غرور کا سر نیچا کرنے کے لئے بے چین

ہوگئی - اس بے چینی نے اُس میں اُداسی بھردی - یہ اُداسی آنسوؤں کو دل سے اُٹھاکر آنکھوں میں لے آئی -

ٹھیک اُسی وقت وہ کمرے میں داخل ہوا -

اُسے دیکھ کر وہ سنّاٹے میں آگئی - اُس کا وہ حُسن غائب ہوچکا تھا - وہ تبسّم گم تھا - ایک سوکھی سی پژمردہ ہنسی چہرے پر ناچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی - وہ بولا "آج میں بہت خوش ہوں"

وہ خاموش نگاہوں سے اُس کے چہرے پر خوشی تلاش کرتی رہی - اُس کی نگاہیں اُس کے غمگین چہرے کا چکر کاٹتی رہیں اور دل کے پردے میں داخل ہونے کی کوشش کرتی رہیں - پھر وہ رو پڑا - اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی -

"یہی ہے خوشی؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا -

وہ فوراً سنبھل گیا "سچ مچ میں بہت خوش ہوں" پھر کہنے لگا -

"مجھے تمہاری شادی کی خبر کل صبح ہی ملی تھی - اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا - اچھا چلتا ہوں - اب ذرا زندگی میں مزا آئے گا - دل تمہاری یادمیں تڑپے گا - تم مل نہ سکو گی - یہ اور بھی پریشان ہوگا - مگر یہی تو محبت ہے - اچھا..."

اور وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر ہمارے افسانوی ادب کا ایک ابھرتا ہُوا ستارہ ہے۔ سنگر موجودہ زمانے کے تلخ حقائق اور بڑے بڑے سماجی مسائل کو بڑے دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرنا خوب جانتے ہیں۔ نفسیاتی گتھیوں میں نہ خود الجھتے ہیں نہ ہی اپنے پڑھنے والوں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جس چیز نے ہمیں خاص طور پر متاثر کیا ہے وہ ان کے مکالمے کی سلاست اور خوبصورتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ننھے مُنے چشموں کی طرح رواں دواں ہیں۔ ان کے ہاں کہیں بھی تکلف اور تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔

ادبِ لطیف، لاہور